ماہنامہ

اشراق

لاہور

ستمبر ۲۰۲۰ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”... غور کرو، کیا یہ دنیا جس کے ہر گوشے میں اتنی حکمتیں اور قدرتیں نمایاں ہیں، بغیر کسی خالق کے وجود میں آگئی ہے؟ یہ سب کچھ محض کسی اندھی بہری علت العلل کا کرشمہ ہے؟ آسمان سے لے کر زمین تک ابر، ہوا، بارش اور انسان و حیوانات کی مایحتاج میں یہ ربط آپ سے آپ پیدا ہو گیا ہے؟ کیا اضداد کی اِس باہمی ہم آہنگی کے مشاہدے کے بعد یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اُس کے اندر مختلف ارادے کار فرما ہیں؟ کیا رحمت و ربوبیت کا یہ اہتمام انسان پر رب رحمٰن و رحیم کی طرف سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتا؟ کیا ہر بارش کے بعد زمین کی از سر نو زندگی اِس حقیقت کی یاد دہانی نہیں کر رہی ہے کہ جو حکیم و قدیر اپنی قدرت و حکمت کا یہ مشاہدہ برابر کرا رہا ہے، اُس کے لیے لوگوں کے مرنے اور مٹی میں مل جانے کے بعد اُن کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے؟“

—— قرآنیات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۲ شمارہ ۹ ستمبر ۲۰۲۰ء محرم الحرام ۱۴۴۲ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 50 روپے
سالانہ 500 روپے
رجسٹرڈ 1000 روپے
(زر تعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 50 ڈالر

فہرست

شذرات

وحی اور فطرت کا باہمی تعلق: جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا تقابلی مطالعہ (۲) — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: الفرقان ۲۵: ۴۵-۶۲ (۴) — جاوید احمد غامدی — ۱۵

مقالات

''میزان''— توضیحی مطالعہ (۳) — محمد عمار خان ناصر — ۲۲

نقطۂ نظر

پاکستان میں غیر مسلموں کی نئی عبادت گاہوں کی تعمیر اور قومی خزانے سے ان پر اخراجات کا مسئلہ — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۳۳

کیا حفظ قرآن کریم کی تعلیمی اہمیت سے انکار ممکن ہے؟ — ڈاکٹر حافظ خورشید احمد قادری — ۳۶

سیر و سوانح

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (۲) — محمد وسیم اختر مفتی — ۵۵

اصلاح و دعوت

احتساب کا وقت — محمد ذکوان ندوی — ۷۲

بے بسی، اُس وقت کی — محمد تہامی بشر علوی — ۷۴

یسئلون

حدیث متواتر — محمد حسن الیاس — ۸۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

سید منظور الحسن

وحی اور فطرت کا باہمی تعلق

جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا تقابلی مطالعہ

(۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں متعدد مقامات پر مختلف زاویوں سے یہ بات بیان کی ہے کہ نیکی اور بدی کی اساسات فطرت انسانی میں راسخ ہیں اور انسان شریعت اور مذہب سے مقدم طور پر ان سے شناسا ہوتا ہے۔ 'باب اقتضاء التکلیف المجازاۃ' کے زیر عنوان انھوں نے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ انسانوں کو ان کے اعمال پر جزا و سزا ملنا کیوں ضروری ہے؟ اس ضمن میں انھوں نے چار اسباب بیان کیے ہیں: ایک سبب وہ ساخت ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ساخت بذات خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان اعمال صالحہ کو انجام دے۔ دوسرا سبب ملاء اعلیٰ کی جہت سے ہے، چنانچہ جب انسان اچھا کام کرتا ہے تو فرشتوں کی جانب سے اس کے لیے مسرت اور سرور کی شعاعیں نکلتی ہیں اور جب وہ برا کام کرتا ہے تو ان سے نفرت اور بغض کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ مجازات عمل کا تیسرا سبب شریعت کا نزول ہے جس کی پسندیدگی کا جذبہ اللہ کی طرف سے انسانوں کے دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ چوتھا سبب انبیا کی بعثت اور ان کی طرف ہونے والی وحی کا متشخص اور ممثل ہو جانا ہے۔ یہ اسباب بیان کر کے انھوں نے لکھا ہے:

...أما المجازاة بالوجهين الأولين ففطرة فطر الله الناس عليها ولن تجد لفطرة الله تبديلاً وليس ذلك إلا في أصول البر والإثم وكلياتها دون فروعها وحدودها وهذه الفطرة هو الدين الذي لا يختلف باختلاف الإعصار، والأنبياء كلهم مجمعون عليه... والمؤاخذة على هذا القدر متحققة قبل بعثة الأنبياء وبعدها سواء.(۱/۲۵)

”...پہلی دو جہتوں سے مجازات عمل تو عین وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے اور فطرت الٰہی میں تم کسی قسم کی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ لیکن یہ صرف بر و اثم کے اصول و کلیات میں ہوتا ہے، نہ کہ ان کی فروعات و حدود میں، اور یہ فطرت ہی وہ دین ہے جو زمانوں کی تبدیلی سے تبدیل نہیں ہوتا اور جس پر تمام انبیاے کرام کا اجماع و اتفاق ہے۔...(دین فطرت کی) اس مقدار پر مواخذہ اور دار و گیر انبیا سے قبل بھی ثابت ہے اور ان کی بعثت کے بعد بھی۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”اتفاق الناس علىٰ أصول الارتفاقات“ کے زیر عنوان انھوں نے بیان کیا ہے کہ ارتفاقات، یعنی انسانی سماج کی تشکیل اور اس کی بقا اور تہذیب کے اصول تمام بنی نوع انسان کے مابین ہمیشہ سے مسلم اور متفق علیہ رہے ہیں۔ اس اتفاق کا سبب ان کے نزدیک فطرت سلیمہ ہے۔ لکھتے ہیں:

اعلم أن الارتفاقات لا تخلو عنها مدينة من الأقاليم المعمورة ولا أمة من الأمم أهل الأمزجة المعتدلة والأخلاق الفاضلة من لدن آدم عليه السلام إلى يوم القيامة وأصولها مسلمة عند الكل قرنًا بعد قرن وطبقة بعد طبقة لم يزالوا ينكرون على من عصاها أشد نكير ويرونها أمورًا بديهية من شدة شهرتها،

”جاننا چاہیے کہ آباد ممالک کا کوئی شہر یا دنیا کی کوئی قوم جو معتدل مزاج اور اخلاق فاضلہ کی حامل ہے، آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک، ان ارتفاقات (یعنی انسانی سماج کی تشکیل اور اس کی بقا اور تہذیب کے اصولوں) سے خالی نہیں ہو سکتی۔ ان ارتفاقات کے اصول سب کے نزدیک نسلاً بعد نسل اور طبقہ در طبقہ مسلم چلے آ رہے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ہمیشہ بڑی سختی سے منع کرتے

ولا يصدنک عما ذکرنا اختلافهم في صور الارتفاقات وفروعها فاتفقوا مثلاً على إزالة نتن الموت وستر سوآتهم ثم اختلفوا في الصور، فاختار بعضهم الدفن في الأرض وبعضهم الحرق بالنار واتفقوا على تشهير أمر النكاح وتمييزه عن السفاح على رؤس الأشهاد ثم اختلفوا في الصور، فاختار بعضهم الشهود والإيجاب والقبول والوليمة وبعضهم الدف والغناء ولبس ثياب فاخرة لا تلبس إلا في الولائم الکبيرة واتفقوا على زجر الزناة والسراق ثم اختلفوا، فاختار بعضهم الرجم وقطع اليد وبعضهم الضرب الأليم والحبس الوجيع والغرامات المنهکة ... ولا ينبغي أن يظن أنهم اتفقوا على ذلک من غير شيء بمنزلة الاتفاق على أن يتغذى بطعام واحد أهل المشارق والمغارب کلهم وهل سفسطة أشد من ذلک؟ بل الفطرة السليمة حاکمة بأن الناس لم يتفقوا عليها مع اختلاف أمزجتهم وتباعد بلدانهم

رہے ہیں۔ بنی نوع انسان ان ارتفاقات کی انتہائی شہرت کی بنا پر انھیں بدیہی امور خیال کرتے ہیں۔ ان ارتفاقات کی ظاہری صورتوں اور ان کی جزئیات کے معاملے میں لوگوں کا اختلاف تمھارے لیے ہماری بات کو تسلیم کرنے میں مانع نہ بنے۔ مثلاً مردوں کی بدبودار اور برہنہ لاشوں کو چھپانے پر ساری دنیا کا اتفاق ہے، گو اس کی صورتوں میں ان کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ مردوں کو زمین میں دفن کرنا پسند کرتے ہیں اور کچھ انھیں جلا دیتے ہیں۔ اسی طرح نکاح کی تشہیر اور لوگوں کے سامنے اس کا اعلان کر کے بدکاری سے اس کو ممتاز کرنے پر بھی انسانوں کا اتفاق ہے۔ پھر اس کی صورتوں میں اختلاف ہے، پس بعض نے گواہوں اور ایجاب و قبول اور ولیمہ کو پسند کیا اور بعض نے دف بجانے اور گانا گانے کو اور ایسے بڑھیا لباس پہننے کو جو صرف شادی بیاہ کی بڑی تقریبات ہی میں پہنے جاتے ہوں۔ زانیوں اور چوروں کو سزا دینے پر بھی اتفاق ہے، لیکن اس کے طریقے میں اختلاف ہے۔ بعض نے سنگ سار کرنے اور ہاتھ کاٹ دینے کا طریقہ اختیار کیا اور بعض نے سخت پٹائی کرنے، تکلیف دہ قید اور کمر توڑ دینے والے جرمانے عائد

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وتشتت مذاهبهم وأديانهم إلا لمناسبة فطرية منشعبة من الصورة النوعية ومن حاجات كثيرة الوقوع يتوارد عليها أفراد النوع ومن أخلاق توجبها الصحة النوعية في أمزجة الأفراد.(۴۸/۱)

کرنے کا۔۔۔اور یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ سب لوگ ان چیزوں پر کسی سبب کے بغیر یوں متفق ہو گئے، جیسے اہل مشرق و مغرب سب ایک ہی طرح کا کھانا کھانے پر متفق ہو جائیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی احمقانہ بات ہو سکتی ہے؟ بلکہ فطرت سلیمہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ لوگ اپنے مزاجوں کے اختلاف اور اوطان کے باہمی فاصلوں اور ادیان و مذاہب کے اختلاف و تنوع کے باوجود ان امور پر کسی ایسی فطری مناسبت ہی کی وجہ سے متفق ہوئے ہیں جو ان کی صورت نوعیہ سے پھوٹتی ہے۔ اس اتفاق کا سبب وہ حاجات بھی ہیں جو بنی نوع انسان کو بہ کثرت پیش آتی ہیں اور وہ اخلاق بھی جن کو افراد کے مزاج میں پیدا کرنے کا تقاضا ان کی صورت نوعیہ کی صحت کرتی ہے۔“

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ’مبحث البرّ والإثم‘ کے عنوان کے تحت انھوں نے بیان کیا ہے کہ نیکی کے قوانین اللہ ہی کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں الہام کیے گئے ہیں:

وكما أن الارتفاقات استنبطها أولو الخبرة فاقتدى بهم الناس بشهادة قلوبهم واتفق عليها أهل الأرض أو من يعتد به منهم فكذلك للبر سنن ألهمها الله تعالى في قلوب المؤيدين بالنور الملكي الغالب عليهم

”اور جس طرح ارتفاقات کو اہل بصیرت نے مستنبط کیا اور لوگوں نے اپنے دلوں کی گواہی کی بنا پر ان کی اقتدا کی اور روے زمین کے سب لوگوں نے یا ان لوگوں نے جن کا کوئی اعتبار ہے، ان پر اتفاق کر لیا، اسی طرح برّ (نیکی) کے بھی قوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے

خلق الفطرة بمنزلة ما ألهم في قلوب النحل ما يصلح به معاشها فجروا عليها وأخذوا بها وأرشدوا إليها وحصوا عليها فاقتدى بهم الناس واتفق عليها أهل الملل جميعها في أقطار الأرض على تباعد بلدانهم واختلاف أديانهم بحكم مناسبة فطرية واقتضاء نوعي ولا يضر ذلك اختلاف صور تلك السنن بعد الاتفاق على أصولها ولا صدود طائفة مخدجة لو تأمل فيهم أصحاب البصائر لم يشكوا أن مادتهم عصت الصورة النوعية ولم تمكن لأحكامها وهم في الإنسان كالعضو الزائد من الجسد زواله أجمل له من بقائه.(۵۸/۱)

ان لوگوں کے دلوں میں الہام کیے ہیں جنھیں نور ملکی کی تائید حاصل ہے اور جن پر فطرت کا رنگ غالب ہے، ایسے ہی جیسے شہد کی مکھیوں کے دلوں میں وہ چیزیں الہام کی گئی ہیں جو ان کی صلاح معاش کے لیے ضروری ہیں۔ پس ان لوگوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا، ان پر چلے، دوسروں کی رہنمائی کی اور انھیں ان کے اپنانے کی ترغیب دی، پس لوگوں نے ان کی پیروی کی اور زمین کے تمام اطراف میں، علاقوں کے مابین دوری اور ادیان کے اختلاف کے باوجود، تمام اہل ملل ان پر متفق ہو گئے جس کی وجہ ایک فطری مناسبت اور انسانوں کی نوع کا تقاضا تھا۔ ان طریقوں کے اصولوں پر اتفاق کے بعد ان کی صورتوں میں اختلاف مضر نہیں، اسی طرح کسی ایسے ناقص (فطرت والے) گروہ کا گریز بھی مضر نہیں جن پر اگر اصحاب بصیرت غور کریں تو انھیں کوئی شبہ نہیں ہو گا کہ ان کا مادہ ہی انسانوں کی صورت نوعیہ کے منافی ہے اور اس کے احکام کے تابع نہیں۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے، جیسے انسان کے جسم میں کوئی زائد عضو ہو اور جس کو کاٹ دینا اس کے باقی رکھنے سے بہتر ہو۔''

صاحب ''تفہیم القرآن'' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی یہی بات بیان کی ہے:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

"... فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اُس کی حیثیت اور نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ 'الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی'۔ "جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت عطا کی پھر راہ دکھائی" (آیت ۵۰)۔ مثلاً حیوانات کی ہر نوع کو اس کی ضروریات کے مطابق الہامی علم دیا گیا ہے جس کی بنا پر مچھلی کو آپ سے آپ تیرنا، پرندے کو اڑنا، شہد کی مکھی کو چھتہ بنانا اور بئے کو گھونسلا تیار کرنا آجاتا ہے۔ انسان کو بھی اُس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے الگ الگ قسم کے الہامی علوم دیے گئے ہیں۔ انسان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے اور اِس حیثیت سے جو الہامی علم اس کو دیا گیا ہے، اُس کی ایک نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ چوسنا ہے جس کی تعلیم اگر خدا نے فطری طور پر اسے نہ دی ہوتی تو کوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔ اُس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے۔ اِس حیثیت سے خدا نے انسان کی آفرینش کے آغاز سے مسلسل اُس کو الہامی رہنمائی دی ہے جس کی بدولت وہ پے در پے اکتشافات اور ایجادات کر کے تمدن میں ترقی کرتا رہا ہے۔ اِن ایجادات و اکتشافات کی تاریخ کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا، وہ محسوس کرے گا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو محض انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ ہو، ورنہ ہر ایک کی ابتدا اِسی طرح ہوئی ہے کہ یکایک کسی شخص کے ذہن میں ایک بات آگئی اور اُس کی بدولت اُس نے کسی چیز کا اکتشاف کیا یا کوئی چیز ایجاد کر لی۔ ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک اخلاقی وجود ہے، اور اِس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر و شر کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر عطا کیا ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر و شر کے تصورات سے خالی نہیں رہا ہے، اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور برائی پر جزا اور سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔ اِس چیز کا ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مرحلۂ تہذیب و تمدن میں پایا جانا اِس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے اور مزید براں یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ ایک خالق حکیم و دانا نے اِسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے، کیونکہ جن اجزاء سے انسان مرکب ہے اور جن قوانین کے تحت دنیا کا مادی نظام چل رہا ہے، اُن کے اندر کہیں اخلاق کے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔" (تفہیم القرآن ۶/ ۳۵۲-۳۵۳)

اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وحی سے مقدم طور پر فطری رہنمائی کا وجود

اکابر علماے امت کے نزدیک اسی طرح مسلم ہے، جیساکہ جناب جاوید احمد غامدی نے اسے بیان کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خالق کی معرفت اور خیر و شر کا احساس اور شعور انسان کی فطرت میں مسلم ہے تو وہ کیا ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ شروع کیا؟ غامدی صاحب کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خیر و شر کے مبادیات کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کو براہ راست ودیعت کر رکھا تھا، مگر ان کے لوازم و اطلاقات اور جزئیات و تفصیلات میں انسان کو مزید رہنمائی کی ضرورت تھی۔ مزید برآں اشخاص، زمانے اور حالات کے فرق کی وجہ سے ان لوازم و اطلاقات اور جزئیات و تفصیلات میں اختلافات کا پیدا ہو جانا قدرتی امر تھا۔ اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیا میں بھیجنے کے بعد وحی کا سلسلہ جاری فرمایا اور اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے ان کی ہدایت کا سامان کیا۔ چنانچہ اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''اخلاقیات'' میں لکھتے ہیں:

> ''(فطرت میں ودیعت خیر و شر کے) اِس الہام کی تعبیر میں، البتہ اشخاص، زمانے اور حالات کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اِس کی گنجایش بھی اُس نے باقی نہیں رہنے دی اور جہاں کسی بڑے اختلاف کا اندیشہ تھا، اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے خیر و شر کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اِن پیغمبروں کی ہدایت اب قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ ہے۔ انسان اپنے اندر جو کچھ پاتا ہے، یہ ہدایت اُس کی تصدیق کرتی ہے اور انسان کا وجدانی علم، بلکہ تجربی علم، قوانین حیات اور حالات وجود سے استنباط کیا ہوا علم اور عقلی علم، سب اِس کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ اخلاق کے فضائل و رذائل اِس کے نتیجے میں پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہو جاتے ہیں۔
>
> روایتوں میں ایک تمثیل کے ذریعے سے یہی بات اِس طرح سمجھائی گئی ہے کہ تم جس منزل تک پہنچنا چاہتے ہو، اُس کے لیے ایک سیدھا راستہ تمھارے سامنے ہے جس کے دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہوئی ہیں۔ دونوں میں دروازے کھلے ہیں جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ راستے کے سرے پر ایک پکارنے والا پکار رہا ہے کہ اندر آجاؤ اور سیدھے چلتے رہو۔ اِس کے باوجود کوئی شخص اگر دائیں بائیں کے دروازوں کا پردہ اٹھانا چاہے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے: خبردار، پردہ نہ اٹھانا۔ اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔ فرمایا ہے کہ یہ راستہ اسلام ہے، دیواریں اللہ کے حدود ہیں، دروازے اُس کی قائم کردہ حرمتیں ہیں، اوپر سے پکارنے والا منادی خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر بندۂ مومن کے دل میں ہے اور راستے کے سرے پر

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پکارنے والا قرآن ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۹)

''(لوگو)، حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ یہ ماننے والوں کو جو اچھے عمل کرتے ہیں، اِس بات کی بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔'' (۲۰۳-۲۰۴)

اس اقتباس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک فطرت کو کیا مقام حاصل ہے اور اس کے تقابل میں وحی کی کیا حیثیت ہے۔ فطرت کی ہدایت اور وحی کی ہدایت میں یہی وہ باہمی تعلق ہے جسے امت کے جلیل القدر علمانے بھی بیان کیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

أن أصل بعثة الانبياء وإن كان لتعليم وجوه العبادات أولا وبالذات لكنه قد تنضم مع ذلك إرادة إخمال الرسوم الفاسدة والحث على وجوه من الارتفاقات، وذلك قوله صلى الله عليه وسلم: ''بعثت لمحق المعازف''. وقوله عليه الصلاة والسلام: ''بعثت لأتمم مكارم الأخلاق''. ... والذي أتي به الأنبياء قاطبة من عند الله تعالٰى في هذا الباب هو أن ينظر إلى ما عند القوم من آداب الأكل والشرب واللباس والبناء ووجوه الزينة ومن سنة النكاح وسيرة المتناكحين ومن

'' انبیا کی بعثت اصلاً اور بالذات اگرچہ عبادات کے رسوم اور طریقے سکھانے کے لیے ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ بسااوقات فاسد معاشرتی رسوم کا خاتمہ اور ارتفاقات کی بعض صورتوں پر لوگوں کو آمادہ کرنا بھی بطور مقصد کے شامل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ مجھے گانے بجانے کے آلات کو ختم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور یہ کہ مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔... اس باب میں تمام کے تمام انبیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو طریقہ لے کر آئے، وہ یہ تھا کہ اس قوم کے ہاں کھانے پینے، لباس، تعمیر، زیب و زینت، نکاح اور زوجین کے باہمی معاملات، بیع و شرا

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

طرق البيع والشراء ومن وجوه المزاجر عن المعاصي وفصل القضايا ونحو ذلک. فإن كان الواجب بحسب الرأي الكلي منطبقًا عليه فلا معنى لتحويل شيء منه من موضعه ولا العدول عنه إلى غيره بل يجب أن يحث القوم على الأخذ بما عندهم وأن يصوب رأيهم في ذلک ويرشدوا إلى ما فيه من المصالح وإن لم ينطبق عليه ومست الحاجة إلى تحويل شيء أو إخماله لكونه مفضيًا إلى تأذي بعضهم من بعض أو تعمقًا في لذات الحياة الدنيا وإعراضًا عن الإحسان أو من المسليات التي تؤدي إلى إهمال مصالح الدنيا والآخرة ونحو ذلک فلا ينبغي أن يخرج إلى ما يباين مألوفهم بالكلية بل يحول إلى نظير ما عندهم.

(حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۰۴)

کی جو بھی صورتیں موجود ہوں اور گناہوں سے روکنے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے جو بھی طریقے رائج ہوں، اگر وہ کلی راے کے اعتبار سے عائد ہونے والی ذمہ داری کے موافق ہوں تو ان میں سے کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹانے یا اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ اس قوم کو ان کے ہاں رائج طریقوں ہی کی پابندی کی ترغیب دی جائے اور اس معاملے میں ان کی راے کی تصویب کی جائے اور اس میں جو مصالح پائے جاتے ہیں، وہ ان پر واضح کیے جائیں۔ البتہ اگر کوئی چیز اس کے موافق نہ ہو اور اس کو بدلنے یا ختم کر دینے کی ضرورت ہو یا اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کی باہمی اذیت کا سبب بنتی ہے یا دنیا کی لذتوں میں کھو جانے اور احسان کے طریقے سے اعراض کا باعث ہے یا ایسی غفلت پیدا کرتی ہے جس سے دنیا اور آخرت کے مصالح برباد ہو جاتے ہیں تو پھر بھی اس قوم کے مانوس طریقوں سے بالکلیہ باہر نکل جانا درست نہیں، بلکہ اس کو تبدیل کر کے انھی کے ہاں موجود کسی نظیر کو اپنانا چاہیے۔“

مولانا امین احسن اصلاحی نے بیان کیا ہے:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

''انسان انبیاے کرام کی رہنمائی کا محتاج اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز یا ان کے شعور سے عاری تھا، بلکہ اس وجہ سے ہوا کہ اس راہ میں اس کو اس کی بعض کمزوریوں کے سبب سے، جن کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں، بہت سے مغالطے پیش آ سکتے تھے، نیز مبادی فطرت کے تمام لوازم اور ان کے سارے مقتضیات کو سمجھنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی کے لیے نبی و رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات چونکہ انھی مبادی پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ودیعت ہیں، اس وجہ سے جو سلیم الطبع تھے، انھوں نے نبیوں کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھا۔ صرف ان لوگوں نے ان کی مخالفت کی جنھوں نے اپنی فطرت مسخ کر ڈالی تھی، اگرچہ اپنے دلوں کے اندر وہ بھی رسولوں کی صداقت و حقانیت کے معترف رہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۹۴)

مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے آدمی کی ساخت اور تراش شروع سے ایسی رکھی ہے کہ اگر وہ حق کو سمجھنا اور قبول کرنا چاہے تو کر سکے اور بدء فطرت سے اپنی اجمالی معرفت کی ایک چمک اُس کے دل میں بطور تخم ہدایت کے ڈال دی ہے کہ اگر گرد و پیش کے احوال اور ماحول کے خراب اثرات سے متاثر نہ ہو اور اصلی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً دین حق کو اختیار کرے، کسی دوسری طرف متوجہ نہ ہو۔ ''عہد الست'' کے قصہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور احادیث صحیحہ میں تصریح ہے کہ ہر بچہ فطرۃ (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے بعدہٗ ماں باپ اُسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو ''حُنفاء'' پیدا کیا۔ پھر شیاطین نے اغوا کر کے اُنھیں سیدھے راستہ سے بھٹکا دیا۔ بہر حال دین حق، دین حنیف اور دین قیم وہ ہے کہ اگر انسان کو اُس کی فطرت پر مخلی بالطبع چھوڑ دیا جائے تو اپنی طبیعت سے اُسی کی طرف جھکے۔ تمام انسانوں کی فطرۃ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی بنائی ہے جس میں کوئی تفاوت اور تبدیلی نہیں۔ فرض کرو اگر فرعون یا ابو جہل کی اصلی فطرت میں یہ استعداد اور صلاحیت نہ ہوتی تو اُن کو قبول حق کا مکلف بنانا صحیح نہ ہوتا۔ جیسے اینٹ پتھر یا جانوروں کو شرائع کا مکلف نہیں بنایا۔ فطرت انسانی کی اسی یکسانیت کا یہ اثر ہے کہ دین کے بہت سے اصول مہمہ کو کسی نہ کسی رنگ میں تقریباً سب انسان تسلیم کرتے ہیں، گو اُن پر ٹھیک ٹھیک قائم نہیں رہتے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی اللہ سب کا مالک حاکم، سب سے نرالا، کوئی اُس کے برابر نہیں، کسی کا زور اُس پر نہیں، یہ باتیں سب جانتے ہیں۔ اُس پر چلنا چاہیے۔ ایسے ہی کسی کے جان و مال

کو ستانا، ناموس میں عیب لگانا، ہر کوئی برا جانتا ہے۔ ایسے ہی اللہ کو یاد کرنا، غریب پر ترس کھانا، حق پورا دینا، دغا نہ کرنا، ہر کوئی اچھا جانتا ہے۔ اِس (راستہ) پر چلنا وہی دین سچا ہے۔ (یہ امور فطری تھے، مگر) ان کا بندوبست پیغمبروں کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے سکھلا دیا۔’’’ (تفسیر عثمانی ۵۲۸)

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الفرقان

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا
الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ﴿۴۵﴾ ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ﴿۴۶﴾

(لوگو، کس ہستی کو چھوڑ کر اِن بتوں کی پرستش پر جمے ہوئے ہو)؟ تم نے دیکھا نہیں اپنے پروردگار کو کہ کس طرح رات کا سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اُس کو (اِسی طرح) ٹھیرا دیتا[۴۸]۔ پھر (دیکھتے نہیں ہو کہ) ہم نے سورج کو اُس پر دلیل[۴۹] بنایا ہے۔ پھر (اِسی سے) آہستہ آہستہ ہم اُس کو اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ ۴۵-۴۶

۴۸۔ یہ امتنان کے لیے فرمایا ہے کہ اگر ٹھیرا دیتا تو اندازہ کر سکتے ہو کہ زمین پر زندگی گزارنا تمھارے لیے کس قدر دشوار ہو جاتا۔

۴۹۔ اِس لیے کہ وہی رات کی عالم گیر تاریکی سے دنیا کو نکالنے کا باعث بنتا ہے، اُسی طرح جیسے کوئی دلیل راہ بن کر راہ کی تمام منازل کو واضح کر دے۔

وَهُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّالنَّوۡمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوۡرًا ﴿۴۷﴾
وَهُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
طَهُوۡرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحۡیِۦَ بِهٖ بَلۡدَةً مَّیۡتًا وَّنُسۡقِیَهٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا وَّاَنَاسِیَّ کَثِیۡرًا ﴿۴۹﴾

وہی ہے جس نے رات کو تمھارے لیے پردہ اور اُس میں نیند کو باعث راحت بنایا[۵۰] اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنادیا[۵۱]۔ ۴۷

اور وہی ہے جو اپنی رحمت (کی بارش) سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ (لوگو، دیکھتے نہیں ہو کہ) ہم آسمان سے پاکیزہ پانی اتارتے ہیں کہ اُس سے شہر کی مردہ زمین میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو اُس سے سیراب کردیں[۵۲]۔ ۴۸-۴۹

۵۰۔ آیت میں لفظ 'سُبَاتًا' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں۔ نیند کو 'سُبَات' اِس لیے کہا ہے کہ یہ عمل کو منقطع کرتی ہے اور اِس طرح انسان کو راحت اور سکون حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے نیند کو دافع کلفت بنا کر تمھارے لیے یہ اہتمام کیا ہے کہ رات کی راحت بخش چادر اوڑھ کر سو جاؤ تاکہ از سر نو زندگی کی سرگرمیوں کے لیے تازہ دم ہو سکو۔

۵۱۔ یہ نہایت لطیف اسلوب میں اشارہ کردیا ہے کہ ہر صبح گویا ایک روز قیامت ہے جس میں تم اُسی طرح اٹھتے ہو، جیسے صبح قیامت کو یک بہ یک موت کی نیند سے جاگ پڑو گے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ محض ایک لفظ 'نُشُوۡر' کے استعمال سے اُس نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

۵۲۔ یہ آیتیں جن حقائق کی طرف توجہ دلا رہی ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مطلب یہ ہے کہ غور کرو، کیا یہ دنیا جس کے ہر گوشے میں اتنی حکمتیں اور قدرتیں نمایاں ہیں، بغیر کسی خالق کے وجود میں آگئی ہے؟ یہ سب کچھ محض کسی اندھی بہری علت العلل کا کرشمہ ہے؟ آسمان سے لے کر زمین تک ابر، ہوا، بارش اور انسان و حیوانات کی مایحتاج میں یہ ربط آپ سے آپ پیدا ہو گیا ہے؟ کیا اضداد کی اِس باہمی ہم آہنگی کے مشاہدے کے بعد یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اُس کے اندر مختلف ارادے کار فرما ہیں؟ کیا

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنٰهُ بَيۡنَهُمۡ لِيَذَّكَّرُوۡا ۖ فَاَبٰۤى اَكۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوۡرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوۡ شِئۡنَا لَبَعَثۡنَا فِىۡ كُلِّ قَرۡيَةٍ نَّذِيۡرًا ﴿۵۱﴾ ۖ فَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِيۡرًا ﴿۵۲﴾

ہم نے اِس قرآن کو اِن کے درمیان طرح طرح سے بیان کیا ہے[۵۳]، (اے پیغمبر)، تاکہ یہ یاددہانی حاصل کریں، مگر اکثر لوگ ناشکری کیے بغیر نہیں رہتے۔ اگر ہم چاہتے تو (اِن کی) ہر بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیج دیتے، (مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ پھر بھی نہ مانتے[۵۴])۔ اِس لیے تم اِن منکروں کی بات کا دھیان نہ کرو[۵۵] اور اِسی قرآن کے ذریعے سے اِن کے ساتھ جہاد کبیر کرتے رہو[۵۶]۔ ۵۰-۵۲

رحمت و ربوبیت کا یہ اہتمام انسان پر رب رحمٰن و رحیم کی طرف سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتا؟ کیا ہر بارش کے بعد زمین کی از سر نو زندگی اِس حقیقت کی یاددہانی نہیں کر رہی ہے کہ جو حکیم و قدیر اپنی قدرت و حکمت کا یہ مشاہدہ برابر کرا رہا ہے، اُس کے لیے لوگوں کے مرنے اور مٹی میں مل جانے کے بعد اُن کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے؟'' (تدبر قرآن ۵/ ۴۷۶)

۵۳۔ یعنی اِن کے ہر گروہ اور ہر طبقے کے درمیان گوناگوں اسلوبوں سے حقائق کو بیان کرتے ہوئے سنا دیا ہے تاکہ اِن میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اُس پر حجت پوری نہیں ہوئی۔

۵۴۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرآن میں بات اتنے مختلف پہلوؤں سے واضح کی گئی ہے کہ ہر گروہ اور ہر طبقے کی رعایت ملحوظ رہی ہے، اُسی طرح ہم اِن کی ہر بستی میں الگ الگ پیغمبر بھی بھیج سکتے تھے، لیکن اِس سے کیا ہوتا؟ اِس کے بعد بھی یہ اِسی ہٹ دھرمی سے انکار کر دیتے۔ اِس لیے مطمئن رہو، یہ اگر نہیں مان رہے اور الٹا تمھارا مذاق بنا رہے ہیں تو اِس میں تمھاری کوئی خامی نہیں ہے، اِنھی کے فساد مزاج کا قصور ہے۔ یہ تمھاری قدر پہچانتے تو کبھی ایسی باتیں نہ کرتے، بلکہ خدا کا شکر ادا کرتے کہ اِن کی سرزمین پر کیسا آفتاب ہدایت طلوع ہوا ہے۔

۵۵۔ یہ اُس بات کی طرف اشارہ ہے جو اوپر نقل ہوئی ہے کہ اچھا، یہی ہے جس کو خدا نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ آیت میں لفظ 'اِطَاعَة' استعمال ہوا ہے۔ یہ کسی کی بات ماننے اور اُس کا لحاظ کرنے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یہاں اِسی مفہوم میں ہے اور ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۵۶۔ یعنی وہی کٹھن جدوجہد جو اِس وقت تم کر رہے ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جن حالات میں اور جیسی جاں گسل جدوجہد اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے کر رہے تھے، یہ لفظ اُس کی رعایت سے استعمال ہوا ہے

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ
بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾
وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾

اور (اِنھیں بتاؤ کہ) وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا کر چھوڑ دیا۔ ایک کا پانی میٹھا ہے، پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری ہے، نہایت کڑوا۔ اور دونوں کے درمیان اُس نے ایک پردہ حائل کر دیا اور ایک اٹل رکاوٹ کھڑی کر دی ہے[57]۔ ۵۳

اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اُس کے نسب اور سسرال ٹھیرائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب بڑی قدرت والا ہے[58]۔ ۵۴

اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی بڑی تحسین ہے۔ اِس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہوئی کہ آپ جس جہاد کے لیے اصلاً مبعوث ہوئے تھے، وہ تلوار سے نہیں، بلکہ قرآن مجید ہی کے ذریعے سے کیا گیا۔

۵۷۔ توحید پر استدلال کے لیے یہ اُس عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا مشاہدہ ہر اُس جگہ کیا جا سکتا ہے، جہاں دو دریا ملتے ہوں یا کوئی بڑا دریا سمندر میں آکر گر رہا ہو۔ دونوں کی موجیں آپس میں ٹکراتی ہیں، لیکن دونوں کا پانی الگ الگ رہتا ہے۔ ایک غیر مرئی دیوار گویا دونوں کے بیچ میں کھڑی ہو جاتی ہے جسے نہ کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ وہ موجوں کے ٹکرانے سے ٹوٹتی ہے۔ یہ واقعہ جس قانون کے تحت ہوتا ہے، اُسے سائنس کی زبان میں سطحی تناؤ (surface tension) کا قانون کہا جاتا ہے۔ سمندروں کے بیچ میں میٹھے پانی کے ذخیرے بھی اِسی قانون کے تحت اپنی مٹھاس پر قائم رہتے ہیں۔ یہ اِس بات کی صاف شہادت ہے کہ ایک ہی بالاتر قوت ہے جو دونوں پانیوں کو اِس طرح تھامے رکھتی ہے۔

۵۸۔ یعنی ایسی قدرت والا ہے کہ اُس نے پانی سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق بنائی، پھر اُس کے جوڑے بنائے اور اب اُنھی کو ملا کر ایک طرف بیٹے اور پوتے پیدا کرتا ہے جو دوسرے گھروں سے بہوئیں لاتے ہیں اور دوسری طرف بیٹیاں اور نواسیاں پیدا کرتا ہے جو بہوئیں بن کر دوسرے گھروں میں چلی جاتی ہیں جس سے خاندان اور خاندانوں سے قومیں وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ یہ انسانی جوڑے بظاہر اضداد ہیں، لیکن اِنھی اضداد

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى
رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿٥٥﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٥٦﴾ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿٥٧﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ
لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴿٥٨﴾ ۚۛ الَّذِيْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ

لیکن اِن کا حال یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر یہ اُن چیزوں کی بندگی کر رہے ہیں جو اِن کو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں، نہ نقصان اور (یہی نہیں)، یہ منکر (تو اب اِس سے آگے) اپنے رب کے حریف بنے ہوئے ہیں[59]۔ ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو بس ایک بشارت دینے والا اور خبر دار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگ رہا ہوں، مگر یہی کہ جو چاہے، وہ اپنے پروردگار تک پہنچنے کی راہ اختیار کر لے۔ تم اُس جیتے پر بھروسا رکھو جو مرنے والا نہیں ہے[60] اور اُس کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے رہو۔ (وہ اِن سے خود سمجھ لے گا)، اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے کے لیے وہ کافی ہے۔ (وہی) جس نے زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا[61]، پھر اپنے عرش پر

کے اندر وابستگی اور پیوستگی اور اُس سے نسبی اور صہری رشتوں کا ظہور اِس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ ایک ہی حکیم و قدیر ہے جس کا ارادہ اِس پوری کائنات میں کار فرما ہے اور اُس کے مقابل میں کوئی نہیں جو اِن اضداد کو وابستہ ہونے سے روک دے۔

۵۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا'۔ اِن میں 'کَافِر' اسم جنس کے مفہوم میں ہے اور 'ظَهِيْر' کے بعد 'عَلٰى' نے اُس کے اندر حریف اور مد مقابل کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔

۶۰۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو ایک لطیف تعریض اُن مردہ خداؤں پر بھی ہے جن کے بارے میں فرمایا ہے کہ نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان۔

۶۱۔ چھ دنوں سے خدائی ایام مراد ہیں جن کے طول و عرض کو وہی جانتا ہے۔ ہم اپنی زبان میں اُنھیں چھ ادوار

اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا ﴿۵۹﴾ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ ۚ قَالُوۡا وَمَا
الرَّحۡمٰنُ ۗ اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا وَزَادَهُمۡ نُفُوۡرًا ﴿۶۰﴾ السجدة

متمکن ہوا[۶۲]۔وہ رحمٰن ہے[۶۳]،سو تم (اُس کی شان) اُسی سے پوچھو جو اُس کو جاننے والا ہے[۶۴]۔جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے[۶۵]؟ کیا ہم اُس کو سجدہ کریں جسے تم سجدہ کرنے کے لیے ہمیں کہہ دو؟ اور اِن کی نفرت کو یہ چیز اور بڑھا دیتی ہے۔۵۵-۶۰

سے تعبیر کر سکتے ہیں۔اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ کائنات کا وجود کوئی وقتی حادثہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے، لہٰذا کبھی عبث نہیں ہو سکتی۔

۶۲۔یہ خدا کے اقتدار کی تعبیر ہے اور آیت میں 'اِسۡتَوٰی' کے ساتھ 'عَلٰی' نے اِس میں تمکن کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ کائنات کو پیدا کر کے اُس کا خالق بے تعلق نہیں ہو گیا، بلکہ اُس کے تخت حکومت پر متمکن ہے اور اُس کے تمام معاملات اُس کی نگرانی میں انجام پا رہے ہیں۔

۶۳۔آیت میں 'اَلرَّحۡمٰنُ' تالیف کے لحاظ سے خبر ہے جس کا مبتدا محذوف ہے۔اِس صفت کی تذکیر سے یہاں جس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اُس نے اِس کائنات کو اپنی رحمت سے وجود بخشا ہے اور اِسی رحمت کے تقاضے سے ایک دن وہ اِس کو اِس کے حقیقی انجام تک بھی پہنچا دے گا۔اِس لیے کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل یا کسی رام کی لیلا ہے۔ ہر گز نہیں، یہ ایک متعین مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے اور اپنے مقصد تک پہنچ کر رہے گی۔

۶۴۔یعنی خود خدا سے پوچھو، اِس لیے کہ اپنی ذات وصفات کو در حقیقت وہی جانتا ہے۔ لفظ 'خَبِيۡر' اِس آیت میں بالکل اُسی طرح آیا ہے، جس طرح سورۂ فاطر (۳۵) کی آیت 'وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثۡلُ خَبِيۡرٍ' (۱۴) میں ہے۔اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے اور 'بِهٖ' اِسی سے متعلق ہے۔

۶۵۔اسم رحمٰن چونکہ اہل کتاب کے ہاں زیادہ معروف تھا، اِس لیے قریش کے لیڈروں نے یہ نکتہ پیدا کر لیا کہ قرآن میں جگہ جگہ اِسی نام سے خدا کا ذکر اِس لیے کیا جاتا ہے کہ اِس سے اہل کتاب کی مذہبی روایات کو ہم پر مسلط کرنا مقصود ہے۔ یہ جملہ اِسی پس منظر میں کہا گیا ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ جَعَلَ فِیۡہَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیۡرًا ﴿۶۱﴾
وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ خِلۡفَۃً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُکُوۡرًا ﴿۶۲﴾

(لوگو، کس سے انحراف کر رہے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ) بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے وہ ذات جس نے آسمان میں مضبوط قلعے بنائے[66] اور اُس میں ایک جلتا چراغ اور ایک چمکتا چاند بنایا اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے بعد آنے والا بنایا، اُن کے لیے جو یاد دہانی حاصل کرنا چاہیں یا شکر گزار بننا چاہیں[67]۔ ۶۱-۶۲

۶۶۔ اِس سے آسمان کے وہ قلعے اور گڑھیاں مراد ہیں جن میں خدا کے ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں اُن سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت مامور رہتی ہیں جن سے آگے کسی جن یا انسان کو بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

۶۷۔ مطلب یہ ہے کہ عقل و دل کو بیدار کرنے والی نشانیوں سے تو اِس کائنات کا چپہ چپہ معمور ہے، لیکن اِس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ارادہ چاہیے۔ تم اِسی ارادے کے امتحان کے لیے پیدا کیے گئے ہو، لیکن افسوس کہ ناکام ہو جاتے ہو اور نہ تمھاری عقل اِن نشانیوں سے یاد دہانی حاصل کرتی ہے اور نہ دل شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہوتا ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد عمار خان ناصر

"میزان" ـــــ توضیحی مطالعہ

(۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مبادی تدبر حدیث

حدیث کے فہم اور تعبیر میں جن اصولوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، مصنف نے انھیں پانچ عنوانات کے تحت بیان کیا ہے: ان میں سے پہلا اصول حدیث کی زبان اور اسالیب سے متعلق ہے، دوسرا حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت کو واضح کرتا ہے، تیسرا حدیث کے موقع و محل اور سیاق کو سمجھنے کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے، چوتھا موضوع سے متعلق تمام احادیث کو پیش نظر رکھنے کی اور پانچواں عقل و نقل کی باہمی تطبیق کی ضرورت کو اجاگر کرتا ہے۔

یہ بحث بنیادی طور پر فہم حدیث کے حوالے سے مولانا امین احسن اصلاحی کے بیان کردہ اصولوں کا اعادہ ہے، جس میں مصنف نے ضروری توضیحات و قیود اور کچھ اہم مثالوں کا اضافہ کیا ہے[1]۔

حدیث کے اسالیب سے واقفیت

"...یہ ضروری ہے کہ حدیث کے طلبہ بار بار کے مطالعے سے اِس زبان کی ایسی مہارت اپنے اندر پیدا کر لیں

۱۔ دیکھیے: مبادی تدبر حدیث، باب ۳، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

کہ نہ 'الشيخ والشيخة' جیسی چیزوں کو محض زبان ہی کی بنیاد پر رد کر دینے میں اُنھیں کوئی تردد ہو اور نہ 'البكر بالبكر' جیسے مشکل اسالیب کو سمجھنے میں وہ کوئی دقت محسوس کریں۔"(میزان ۶۵)

اس اقتباس میں مصنف نے حدیث کی زبان اور اس کے اسالیب سے گہری واقفیت کی اہمیت دو پہلوؤں سے واضح کی ہے:

پہلا یہ کہ عربی زبان کا اعلیٰ ذوق اور حدیث کے اسالیب کی ممارست، بعض روایات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب الفاظ کی صحت یا عدم صحت کو جانچنے میں مدد دیتی ہے۔ مصنف نے اس ضمن میں ان روایات کا حوالہ دیا ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ رجم کی سزا قرآن مجید میں ان الفاظ میں نازل ہوئی تھی:

الشيخ والشيخة إذا زنيا فارجموهما البتة. (المستدرک علی الصحیحین، رقم ۳۵۱۳)	"بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت اگر زنا کریں تو ان کو لازماً رجم کر دو۔"

اپنی کتاب "برہان" میں مصنف نے اس روایت پر تفصیلی کلام کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کے مضمون پر دوسرے پہلوؤں سے جو سنگین اعتراضات پیدا ہوتے ہیں، ان سے قطع نظر اس میں جن الفاظ کو قرآن کی آیت قرار دیا گیا ہے، وہی لفظی اور معنوی لحاظ سے اس قدر رکیک ہیں کہ انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کی نسبت سے قبول ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف لکھتے ہیں:

"...وہ جملہ جسے اِس روایت میں قرآن کی آیت قرار دیا گیا ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے اِس قدر پست ہے کہ قرآن کے مخمل میں اِس ٹاٹ کا پیوند لگانا اور اُس کی لاہوتی زبان کے ساتھ اِس کا جوڑ ملانا تو ایک طرف، کسی سلیم المذاق آدمی کے لیے اِسے پیغمبر کا قول قرار دینا بھی ممکن نہیں ہے۔"(برہان ۶۱)

کم و بیش اسی اسلوب میں یہ تنقید مولانا اصلاحی نے بھی اس روایت پر کی ہے (تدبر قرآن ۵/ ۳۶۶-۳۶۷)۔

روایت کے الفاظ کی رکاکت کو اس کے موضوع ہونے کی نشانی کے طور پر علماے حدیث نے بھی بطور اصول بیان کیا ہے۔ چنانچہ مولانا عبد الحئ لکھنوی لکھتے ہیں:

(أو بركاكة الفاظه) بحيث يعلم العارف باللسان أن مثله لا يصدر عن فصيح اللسان فضلاً عن أن يكون كلام النبي صلى الله عليه وسلم، قال ابن دقيق العيد: كثيرًا	"حدیث کا موضوع ہونا اس کے الفاظ کی رکاکت سے بھی معلوم ہو جاتا ہے، اور وہ یوں کہ زبان سے واقف یہ جان لیتا ہے کہ ایسا کلام کسی فصیح اللسان کی زبان سے بھی نہیں نکل سکتا، چہ جائیکہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام

ما يحكمون بذالك باعتبار أمور ترجع إلى المروي وألفاظ الحديث، وحاصله يرجع إلى أنه حصلت لهم لكثرة محاورة الفاظ النبي صلى الله عليه وسلم هياة نفسانية وملكة قوية يعرفون بها ما يجوز أن يكون من ألفاظ النبوة وما لا يجوز.
(ظفر الامانی بشرح مختصر السید الشریف الجرجانی ۴۲۹)

تصور کیا جائے۔ امام ابن دقیق العید لکھتے ہیں کہ محدثین بہ کثرت حدیث کے مضمون اور اس کے الفاظ سے تعلق رکھنے والے پہلوؤں کی وجہ سے حدیث پر وضع کا حکم لگا دیتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کی کثرت ممارست کی وجہ سے محدثین کو ایک خاص نفسی ہیئت اور ایک مضبوط ملکہ حاصل ہو جاتا ہے جس کی بدولت وہ جان لیتے ہیں کہ کس قسم کی تعبیرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو سکتی ہیں اور کس قسم کی نہیں ہو سکتیں۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حدیث کے لسانی اسالیب کی ممارست کی اہمیت کا دوسرا پہلو جو مصنف نے واضح کیا ہے، وہ حدیث کے مفہوم کی تعیین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر مصنف نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی درج ذیل معروف حدیث کا ذکر کیا ہے:

البكر بالبكر جلد مائة ونفي سنة والثيب بالثيب جلد مائة والرجم.
(مسلم، رقم ۱۶۹۰)

''کنوارا مرد کنواری عورت کے ساتھ (زنا کرے تو) سو کوڑے لگائے جائیں اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے۔ شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت کے ساتھ بدکاری کرے تو سو کوڑے لگائے جائیں اور سنگ سار کر دیا جائے۔''

اس جملے کا مفہوم شارحین نے بالعموم یہ بیان کیا ہے کہ کنوارا مرد کنواری عورت کے ساتھ زنا کرے تو ان کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے، جب کہ شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت کے ساتھ بدکاری کرے تو ان کی سزا سو کوڑے اور سنگ سار کرنا ہے۔ اس تعبیر کے مطابق حدیث میں زنا کی ان صورتوں کا حکم واضح کیا گیا ہے جب دونوں فریقوں کی ازدواجی حیثیت ایک جیسی ہو۔ اگر ایک فریق کنوارا اور دوسرا شادی شدہ ہو تو اس کا حکم قیاساً متعین کیا جائے گا، یعنی کنوارے کو سو کوڑے لگائے جائیں گے، جب کہ شادی شدہ کو سنگ سار کیا جائے گا۔ مصنف کو اس تفہیم سے اختلاف ہے اور ان کی رائے میں یہاں 'البكر بالبكر' اور 'الثيب بالثيب' کا

اسلوب بدکاری کے دو فریقوں کو بیان نہیں کرتا، بلکہ اس کا مدعا یہ بتانا ہے کہ بدکاری کرنے والا مرد ہو یا عورت، ان کی سزا ایک جیسی ہے، یعنی کنوارے مرد کی سزا وہی ہو گی جو کنواری عورت کی ہے اور اسی طرح شادی شدہ مرد اسی سزا کا حق دار ہو گا جو شادی شدہ عورت کی ہے۔ چنانچہ مصنف نے اس جملے کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"...اِس طرح کے مجرموں میں کنوارے کنواریوں کے ساتھ ہوں گے اور اُنھیں سو کوڑے اور جلاوطنی کی سزادی جائے گی۔ اِسی طرح شادی شدہ مرد و عورت بھی سزا کے لحاظ سے ساتھ ساتھ ہوں گے اور اُنھیں سو کوڑے اور سنگ ساری کی سزادی جائے گی۔" (میزان ۶۱۶)

اس توجیہ کے حق میں ایک قرینہ یہ ہے کہ روایت کے بعض طرق میں حدیث کے الفاظ یوں نقل ہوئے ہیں:

الثيب بالثيب والبكر بالبكر، الثيب جلد مائة ثم رجم بالحجارة، والبكر جلد مائة ثم نفي سنة. (مسلم، رقم ۱۶۹۰)

"شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت کے ساتھ ہے اور کنوارا مرد کنواری عورت کے ساتھ۔ شادی شدہ کو سو کوڑے لگائے جائیں اور پھر سنگ سار کر دیا جائے، اور کنوارے کو سو کوڑے لگائے جائیں اور پھر ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے۔"

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ یہی ہوں جو اس طریق میں نقل کیے گئے ہیں تو مصنف کی اس راے کا وزن بڑھ جاتا ہے کہ یہاں دراصل زانی مرد اور عورت کا ان کی ازدواجی حیثیت کے لحاظ سے یکساں سزا کا حق دار ہونا بیان کرنا پیش نظر ہے۔

حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا

"... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیثیت نبوت ورسالت میں جو کچھ کیا، اُس کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ بھی قرآن ہی ہے۔ لہٰذا حدیث کے بیش تر مضامین کا تعلق اُس سے وہی ہے جو کسی چیز کی فرع کا اُس کی اصل سے اور شرح کا متن سے ہوتا ہے۔ اصل اور متن کو دیکھے بغیر اُس کی شرح اور فرع کو سمجھنا، ظاہر ہے کہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔" (میزان ۶۵)

اس اصول کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مصنف نے زانیوں کے رجم اور کعب بن اشرف کے قتل کے واقعات، عذاب قبر اور شفاعت کی روایات، 'أمرت أن أقاتل الناس' اور 'من بدل دينه فاقتلوه' جیسی

احادیث کا حوالہ دیا ہے۔ کتاب میں متعلقہ مقامات پر مصنف نے قرآن کی روشنی میں ان احادیث کی جو تفہیم پیش کی ہے، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

رجم کی سزا سے متعلق مصنف مولانا امین احسن اصلاحی کے اس موقف سے اتفاق کرتے ہیں کہ احادیث میں بیان کی جانے والی یہ سزا قرآن کے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں کرتی، بلکہ اس کا ماخذ آیت محاربہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے 'محاربہ' اور 'فساد فی الارض' کے مجرموں کے لیے عبرت ناک طریقے سے قتل کرنے، سولی چڑھانے، ہاتھ پاؤں الٹے کاٹ دینے اور جلاوطن کر دینے کی سزائیں بیان کی ہیں۔ گویا شادی شدہ زانی کی اصل سزا تو سو کوڑے ہی ہے، جب کہ رجم دراصل اوباشی اور آوارہ منشی، یعنی 'فساد فی الارض' کی سزا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ مائدہ کی مذکورہ آیت کے تحت بعض مجرموں پر نافذ کی تھی (برہان ۹۱۔ میزان ۴۰-۴۱)۔

کعب بن اشرف کے قتل کے اقدام کو مصنف اتمام حجت کے اصول کی روشنی پر مبنی قرار دیتے ہیں جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رو سے رسول کے براہ راست مخاطبین اللہ کے عذاب کی زد میں ہوتے ہیں اور ان میں سے جو معاندت پر اتر آئیں، انھیں قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ کعب بن اشرف چونکہ مسلمانوں کے خلاف قریش کو برانگیختہ کرنے، مسلمانوں کی خواتین کے متعلق عشقیہ شاعری کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے جیسی سازشوں میں ملوث تھا، اس لیے اس کی حیثیت صریحاً ایک معاند کی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنیاد پر اسے قتل کرایا تھا (مقامات ۴۷۲۔ میزان ۵۹۹)۔

موت کے وقت مردے کو بشارت یا زجر وتوبیخ اور اسی طرح قبر میں سوال وجواب اور ثواب یا عذاب کی روایات کا ماخذ بھی مصنف نے قرآن مجید میں متعین کیا ہے۔ مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بعد از وفات فوری ثواب یا عذاب کا یہ معاملہ اللہ کے پیغمبروں کے براہ راست مخاطبین کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ ایسے لوگوں پر پیغمبر اتمام حجت کر چکے ہوتے ہیں، اس لیے ان کے ثواب وعذاب کو قیامت تک موخر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ان کے مرتے ہی ان کے انعام واکرام یا عذاب کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے (میزان ۱۸۷-۱۸۹)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے، قیامت کے دن اپنے امتیوں کے حق میں شفاعت کرنے کی احادیث کو مصنف قرآن مجید کی روشنی میں اس شرط کے ساتھ مشروط کرتے ہیں کہ "بندے کی طرف سے توبہ واستغفار کے بغیر اس کا کوئی تصور نہیں ہے" (میزان ۱۵۰)۔ نیز یہ کہ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ پر صرف انھی لوگوں کی توبہ قبول

کرنے کا حق قائم ہوتا ہے جو گناہ کے بعد فوراً نادم ہو کر توبہ کی طرف لپکتے ہیں، اس لیے جو لوگ گناہ کے بعد فوراً توبہ تو نہیں کرتے، لیکن اتنی دیر بھی نہیں کرتے کہ موت کا وقت آپہنچے، ''یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں شفاعت کی توقع ہو سکتی ہے'' (میزان ۱۵۱)۔

'أمرت أن أقاتل الناس' کی تشریح قرآن مجید کی روشنی میں کرتے ہوئے مصنف نے واضح کیا ہے کہ یہ دراصل اتمام حجت کے قانون پر مبنی ہے جس کی رو سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب پر لازم ٹھیرایا تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیں، ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا (برہان ۱۴۱-۱۴۲)۔

ارتداد اختیار کرنے پر قتل کی سزا کا تناظر بھی مصنف کی راے میں اتمام حجت کا یہی قانون ہے اور اس کا تعلق انھی مشرکین عرب سے ہے جنھیں اصلاً اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ مصنف کا استدلال یہ ہے کہ مذکورہ دونوں حکموں کی اصل جب قرآن مجید میں اس خصوص کے ساتھ موجود ہے تو اس کی اس فرع میں بھی یہ خصوص لازماً برقرار رہنا چاہیے (برہان ۱۴۲-۱۴۳)۔

مذکورہ روایات کے علاوہ قرآن اور حدیث کے باہمی تعلق کی ایک دوسری جہت پر مصنف نے مبادی تدبر قرآن کے تحت قرآن کے قطعی الدلالہ ہونے کی بحث کے ضمن میں کیا ہے۔ وہاں زیر بحث سوال یہ ہے کہ کیا حدیث، قرآن کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس کو منسوخ کر سکتی ہے۔ مصنف نے اس بحث میں بھی یہی موقف اختیار کیا ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں اور اس کے تابع رکھتے ہوئے سمجھنا ضروری ہے۔ مصنف کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> ''... حدیث سے قرآن کے نسخ اور اُس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوء فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اِس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اِس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے، کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔ قرآن کے بعض اسالیب اور بعض آیات کا موقع و محل جب لوگ نہیں سمجھ پائے تو اُن سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی صحیح نوعیت بھی اُن پر واضح نہیں ہو سکی۔ اِس طرح کی جتنی مثالیں بالعموم پیش کی جاتی ہیں، اُن سب کا معاملہ یہی ہے۔'' (میزان ۳۶)

اس حوالے سے مصنف نے حدیث میں قرآن کی تحدید و تخصیص کی چند معروف مثالوں پر بھی تفصیلی کلام کیا اور قرآن کے ساتھ ان کے تعلق کی درست نوعیت کو واضح کیا ہے۔ اس پر کچھ توضیحات متعلقہ مقام پر پیش کی جائیں گی۔

موقع و محل

”... حدیث میں جو مضمون بیان ہوا ہے، اُس کے موقع و محل کو سمجھ کر اُس کا مدعا متعین کیا جائے۔ بات کس وقت کی گئی، کس سلسلے میں کی گئی اور کن لوگوں سے کی گئی، یہ سب چیزیں اگر ملحوظ نہ رکھی جائیں تو نہایت واضح باتیں بھی بسا اوقات لاینحل معما بن جاتی ہیں۔ فہم حدیث میں اِس اصول کی اہمیت غیر معمولی ہے۔“ (میزان ۶۵)

مصنف نے یہاں جس اصول کی وضاحت کی ہے، وہ اصولی طور پر تمام فقہا کے ہاں مسلم ہے اور تمام اہل علم یہ قرار دیتے ہیں کہ حدیث کے فہم میں اس خاص واقعاتی تناظر کو ملحوظ رکھنا بہت اہم ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات ارشاد فرمائی۔ چنانچہ فقہا و محدثین کے ہاں کسی حدیث کے مدعا و مراد کی تعیین میں اس تناظر کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے اور ان کی آرا میں اس اصول کی رعایت کی بہت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔

مثلاً فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں یہ ارشاد فرمایا کہ ’لا يقتل مؤمن بكافر‘، یعنی کسی مسلمان کو کسی کافر کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے (احمد، رقم ۶۶۹۲)۔ جمہور فقہا نے اس کا مفہوم یہ مراد لیا ہے کہ کسی مسلمان کو غیر مسلم کے قصاص میں قتل نہیں کیا جا سکتا، لیکن امام ابو بکر الجصاص کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں مسلم اور غیر مسلم کے قصاص کے حوالے سے کوئی قانونی حکم بیان نہیں فرما رہے۔ آپ دراصل فتح مکہ کے موقع پر مشرکین کے بڑی تعداد میں مسلمان ہو جانے کے تناظر میں لوگوں کو یہ تلقین کر رہے ہیں کہ ان کے مابین اس سے پہلے قتل اور قصاص کے جو معاملات چلے آ رہے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد وہ کالعدم ہو چکے ہیں، اس لیے اگر کسی شخص نے حالت کفر میں کسی کو قتل کیا تھا تو اب اسلام قبول کرنے کے بعد اسے اس کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے (احکام القرآن ۱/ ۱۷۶)۔

اسی طرح ایک حدیث میں منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ’أنا بريء من كل مسلم مقيم بين أظهر المشركين‘، یعنی ”میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے مابین سکونت پذیر ہو“ (بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۴۷۱)۔

بعض فقہا نے اس روایت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مسلمان کا مشرکین کے مابین سکونت کرنا مطلقاً جائز نہیں، لیکن روایت کے مطابق آپ نے یہ بات اس موقع پر ارشاد فرمائی جب آپ نے بنو خثعم کی طرف ایک سریہ بھیجا۔ ان میں سے کچھ لوگ مسلمان تھے اور حملہ ہونے پر انھوں نے سجدے میں گر کر مسلمانوں سے امان طلب کرنے کی کوشش کی، لیکن لڑائی کی افراتفری میں وہ بھی حملے کی زد میں آ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو

آپ نے ان کی نصف دیت کی ادائیگی کا حکم دیا اور اس موقع پر فرمایا کہ میں ہر اس مسلمان کی حفاظت سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان مقیم ہو۔ گویا آپ کی مراد یہاں یہ واضح کرنا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ایسے غیر مسلم گروہ کے ساتھ مقیم ہے جو مسلمانوں کے خلاف بر سر جنگ ہے تو ان کے خلاف جنگی کارروائی کرتے ہوئے اگر وہ تلوار کی زد میں آ جائے تو اس کی حفاظت یا اس کی دیت ادا کرنے کی کوئی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی (اعلاء السنن ۶۷۹/۱۲)۔

مصنف نے اس اصول کی انطباقی مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا ہے کہ حکمرانی کا منصب قریش کے لیے خاص ہے (بخاری، رقم ۶۶۰۶)۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی عہد میں یہ مسئلہ اہل سنت اور خوارج و معتزلہ کے مابین ایک بڑے کلامی نزاع کا عنوان رہا ہے۔ خوارج غیر قریشی کے خلیفہ بننے کے جواز کے قائل تھے، جب کہ اہل سنت کا استدلال یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی بنیاد پر خلافت و حکومت، قریش کے ساتھ خاص ہے۔ حتیٰ کہ جب عربوں کے اس منصب کے لیے عملی اعتبار سے نااہل ہونے کے تناظر میں اہل سنت کے بعض اہل علم، مثلاً قاضی ابو بکر الباقلانی وغیرہ نے ضرورتاً اس شرط کو ساقط کرنے کی رائے پیش کی تو اسے بھی خلاف اجماع قرار دے کر اس پر تنقید کی گئی (دیکھیے: مقدمہ ابن خلدون ۹۹/۱)۔

تاہم جب قریش کی خلافت کا عملاً خاتمہ ہو گیا تو اہل علم کو از سر نو ان احادیث کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ابن حجر وغیرہ نے روایات کے داخلی قرائن کی روشنی میں یہ رائے پیش کی کہ قریش کے لیے بیان کیا جانے والا یہ استحقاق مطلق نہیں، بلکہ اہلیت اور عدل وانصاف کے ساتھ مشروط تھا اور ان کا طویل عرصے تک اس منصب پر فائز رہنا اور پھر اس سے محروم کر دیا جانا اس شرط کے عین مطابق ہے (فتح الباری ۱۵۵/۲۰)۔

مصنف کی رائے میں یہ ہدایت ابتدا ہی سے ایک خاص تناظر میں دی گئی تھی اور اس کا مدعا کوئی ایسی ہدایت دینا نہیں تھا جس کی پابندی ہمیشہ اور ہر طرح کے حالات میں امت کے لیے لازم ہو۔

احادیث باب پر نظر

”... کسی حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اِس باب کی تمام روایات پیش نظر رکھی جائیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی حدیث کا ایک مفہوم سمجھتا ہے، لیکن اُسی باب کی تمام روایتوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ مفہوم بالکل دوسری صورت میں نمایاں ہو جاتا ہے۔“ (میزان ۶۶)

یہ حدیث کے فہم اور اس کے مدعا کی تعیین کا ایک واضح اور مسلمہ ضابطہ ہے۔ مصنف نے اس کی وضاحت

کے لیے تصویر کی ممانعت سے متعلق وارد احادیث کا حوالہ دیا ہے۔ اہل علم کے ایک طبقے کی راے میں ہر جان دار کی تصویر مطلقاً اس ممانعت کے دائرے میں آتی ہے۔ تاہم مصنف نے اخلاقیات کے مبحث میں ان احادیث کو مشرکانہ تصورات کے پس منظر میں واضح کیا ہے اور اس ضمن میں صحیح بخاری کی اس روایت کا حوالہ دیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن تصویریں اور مجسمے بنانے والوں سے کہا جائے گا کہ ان میں اب جان ڈال کر دکھاؤ۔ مصنف کی راے میں مصورین سے کیا جانے والا یہ تقاضا واضح کرتا ہے کہ اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو اپنے زعم کے مطابق کچھ زندہ اور نافع وضار ہستیوں کی تصویریں بناتے تھے، یعنی ان کی تصویر سازی کا محرک مشرکانہ اوہام وظنون تھے۔ مصنف، تصویر کی ممانعت کے بارے میں وارد تمام احادیث کو اسی نوعیت کی تصاویر سے متعلق قرار دیتے ہیں اور عام تصویروں کو کسی بھی لحاظ سے اس ممانعت میں شامل نہیں سمجھتے (میزان ۲۱۲)۔

احادیث باب کی روشنی میں بات کی درست نوعیت متعین کرنے کی ایک اور مثال عبد الرحمٰن بن زبیر کی بیوی کا واقعہ ہے جس نے اپنے شوہر سے اس بنیاد پر علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا کہ وہ مردانہ صلاحیت سے محروم ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ جب تک وہ اپنے شوہر سے ہم بستر نہ ہو لے، اس سے طلاق لے کر پہلے شوہر سے نکاح نہیں کر سکتی (بخاری، رقم ۵۲۶۵)۔ جمہور فقہانے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ ایک شوہر سے تین طلاقیں مل جانے کے بعد عورت جب تک دوسرے شوہر سے نکاح کر کے ہم بستری نہ کر لے، وہ پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔

مصنف کے نزدیک زیر بحث حدیث کا مدعا ہم بستری کو ایک شرط کے طور پر بیان کرنا نہیں ہے، جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔ وہ اس واقعے سے متعلق مروی تفصیلات سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ ”... عورت نے نکاح کیا ہی اِس مقصد سے تھا کہ وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے۔ چنانچہ طلاق لینے کے لیے اُس نے جب غلط بیانی کر کے دوسرے شوہر کو زن وشو کا تعلق قائم کرنے سے قاصر قرار دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس پر سرزنش کے لیے اُسے یہ کہہ کر پہلے شوہر کے پاس جانے سے روک دیا کہ اب تم اِس دوسرے شوہر سے لذت اندوز ہونے کے بعد ہی اُس کے پاس جا سکتی ہو۔ یہ بیان شرط نہیں، بلکہ تعلیق بالمحال کا اسلوب ہے۔ لہٰذا یہ روایت اگر کسی چیز کا ثبوت ہے تو حلالہ کی ممانعت کا ثبوت ہے، اِس میں فقہا کے موقف کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے“ (میزان ۴۵۳)۔

عقل و نقل

”... دین کی بنیاد ہی علم و عقل کے مسلمات پر قائم ہے، لہٰذا کوئی چیز اگر اِن مسلمات سے مختلف نظر آتی ہے تو اُس پر بار بار غور کرنا چاہیے۔ یہ کوئی علمی طریقہ نہیں ہے کہ اِس طرح کے مواقع پر آدمی فوراً حدیث کو رد کر کے فارغ ہو جائے یا علم و عقل سے آنکھیں بند کر کے اُس کے کوئی غلط یا مرجوح معنی قبول کر لے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ روایت کو جب صحیح پہلو سے دیکھا گیا تو بارہا کوئی اختلاف باقی نہیں رہا اور بات ہر لحاظ سے واضح ہو گئی۔“

(میزان ٦٦)

یہ اصول فہم حدیث سے بھی متعلق ہے اور اس کے ساتھ اخبار آحاد کے رد و قبول کے ضمن میں بیان کیے گئے ایک بنیادی اصول کی بھی مزید توضیح کرتا ہے۔ محولہ بحث میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ کوئی خبر واحد جو علم و عقل کے مسلمات سے متعارض ہو، اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ زیر نظر اصول اس میں یہ اہم اضافہ شامل کرتا ہے کہ ایسے مواقع پر روایت کو عجلت میں اور علی الفور رد کر دینے کے بجاے اس پر توقف کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت سی صورتوں میں غور و فکر کے نتیجے میں روایت کا ایسا محل واضح ہو جاتا ہے جس سے عقل و نقل کا ظاہری اختلاف باقی نہیں رہتا۔

مصنف اور مولانا اصلاحی کا روے سخن اس اصول کی وضاحت میں غالباً دور جدید کے بعض ایسے حلقوں کی طرف ہے جو ذخیرۂ حدیث کی وقعت اور تاریخی استناد پر سوال اٹھاتے ہوئے مختلف احادیث کے مضمون پر عقلی اعتراضات وارد کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال قراءت کے اختلافات بیان کرنے والی روایات ہیں۔ علامہ تمنا عمادی اور بعض دیگر اہل قلم نے ان روایات کو اور ان پر مبنی پورے ذخیرۂ قراءات کو دشمنان دین کی سازش اور وضع کا نتیجہ قرار دیا ہے، جس کا مقصد قرآن کے متن کی حفاظت اور قطعیت کو مشکوک بنانا تھا۔

مصنف کو اگرچہ اس بنیادی موقف سے اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی ایک ہی مستند قراءت ہے جو تواتر سے ثابت ہے اور اس سے ہٹ کر قرآن کے متن کو مختلف طریقوں سے پڑھنا درست نہیں ہے، تاہم وہ اختلاف قراءت کی روایات کو علی الاطلاق وضع کا نتیجہ نہیں سمجھتے، بلکہ ان کی ایک تاریخی توجیہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی راے میں عرضۂ اخیرہ کی قراءت سے پہلے قرآن کے متن کو بعض مقامات پر مختلف طریقوں سے پڑھنے کی گنجایش رکھی گئی تھی جو اگرچہ عرضۂ اخیرہ کی قراءت کے بعد اصولاً منسوخ کر دی گئیں، لیکن دور اول کے اہل علم قابل اعتماد اخبار آحاد کے ذریعے سے نقل ہونے والی ان مختلف قراءتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اسی سے رفتہ رفتہ

قراءات کا ایک مستقل علم وجود میں آ گیا جس سے فقہا و مفسرین کو بھی اعتنا کرنا پڑا اور اخبار آحاد کی حجیت کے موقف کے پیش نظر ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جس طرح انھوں نے باقی دینی و شرعی امور سے متعلق اخبار آحاد کو قبول کیا ہے، قراءت کے اختلافات بیان کرنے والی روایات کو بھی قبول کریں (اشراق، جنوری ۲۰۱۵ء، ۳۰-۳۱)۔

زیر بحث اصول کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی سامنے رہنا چاہیے کہ اگرچہ ظاہراً اس کا ذکر عقل و نقل کے مبینہ تعارض کے ضمن میں ہوا ہے، لیکن مصنف کا اصولی رجحان اخبار آحاد اور قرآن مجید کے باہمی تعارض کے باب میں بھی یہی ہے۔ مصنف امام شافعی کے اس موقف سے متفق ہیں کہ حدیث، قرآن کی صرف تبیین کر سکتی ہے، اس کے حکم میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔ تاہم امام شافعی قرآن مجید کے عموم میں تخصیص کو اس صورت میں بھی تبیین ہی قرار دیتے ہیں جب ایسی کوئی تخصیص حدیث میں بیان ہوئی ہو، چاہے اس کا کوئی ظاہری قرینہ یا اساس خود قرآن کے حکم میں نہ بتائی جا سکے، جب کہ مصنف کے نزدیک یہ صورت تبیین کے دائرے سے متجاوز ہے اور نسخ و تغییر کے زمرے میں آتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر، امام شافعی کے نزدیک خود قرآن میں کسی حکم کی تخصیص کے قرائن واضح نہ ہوں تو بھی تخصیص کو صرف حدیث میں وارد ہونے کی بنا پر قرآن کی مراد تسلیم کرنا ضروری ہے۔ مصنف کے نزدیک اگر ایسی کوئی صورت بالفرض پائی جاتی ہو تو اصولاً اسے تبیین نہیں کہا جا سکتا اور نتیجتاً قبول بھی نہیں کیا جا سکتا، تاہم ایسی کوئی صورت عملاً پائی نہیں جاتی اور تمام مستند احادیث کا تعلق قرآن سے تبیین کے اصول پر واضح کیا جا سکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کے تحت مصنف نے سنت میں بیان ہونے والے تمام ایسے احکام کا ماخذ، جنھیں فقہا و اصولیین قرآن کی تخصیص یا اس پر زیادت کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں، خود قرآن مجید میں متعین کیا ہے۔ یہ مصنف کے متعین کردہ علمی منہج کی اہم ترین خصوصیات میں سے ہے اور ''میزان'' میں اسی کے تحت تمام اعتقادی و فقہی نوعیت کے مباحث میں قرآن کے بیانات کے ساتھ احادیث کے تعلق کو واضح کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے متعدد ایسی اخبار آحاد کا ماخذ بھی قرآن مجید میں واضح کیا ہے جنھیں حنفی یا مالکی فقہا قرآن کے ظاہری عموم کے خلاف ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کرتے (تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''قرآن و سنت کا باہمی تعلق: اصولی مواقف کا علمی جائزہ'')۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

پاکستان میں غیر مسلموں کی نئی عبادت گاہوں کی تعمیر اور قومی خزانے سے ان پر اخراجات کا مسئلہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حجاز کو اللہ تعالیٰ نے توحید کا مرکز بنا کر مقدس کیا، کعبہ خداے واحد کے گھر اور قبلے کی حیثیت سے تعمیر ہوا۔ وہاں جب شرک نے قبضہ کر لیا تو یہ قبضہ واگزار کرایا گیا اور مشرکانہ عبادت گاہوں اور آثار کو مٹا ڈالا گیا۔ حجاز کی یہ خصوصی حیثیت ہے کہ وہاں کوئی مشرکانہ عبادت گاہ قائم رہ سکتی ہے اور نہ تعمیر کی جاسکتی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کعبہ کو بیت اللہ ہونے کی خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ نہ کعبہ کہیں اور تعمیر ہو سکتا ہے اور نہ حجاز جیسا تقدس کسی اور زمین کو دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے حجاز سے باہر کسی بت خانہ، کسی آتش کدہ کو نہیں گرایا اور نہ ایسی عبادت گاہوں کی نئی تعمیر کو روکنے کا کوئی واقعہ، ہمارے علم کی حد تک، نقل ہوا ہے۔ اگر نئی تعمیر سے روکا جاتا تو یقیناً یہ ایک واقعہ بنتا جو تاریخ میں درج ہوتا۔ البتہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں جو نئے شہر بسائے، اس کے مالکانہ حقوق کی بنا پر اگرچہ انھیں حق تھا کہ غیر مسلم عبادت گاہ کی نئی تعمیر سے منع کر دیتے۔ تاہم ان کے نئے شہروں میں کوئی غیر اسلامی معبد وہاں تعمیر ہوا یا نہیں؟ یہ تاریخی معلومات کا موضوع ہے جس پر تحقیق درکار ہے۔

دور جدید میں بین الاقوامی سطح پر اقوام کی ایک نئی تقسیم وجود میں آئی۔ جنگوں کے ذریعے سے ممالک فتح کرنے کی صدیوں پرانی طاقت کی روایت کو قانون کی بیڑیاں پہنانے کی کوشش کی گئی اور طے پایا کہ جس قوم کے لیے جو سرحدیں مقرر کر دی جائیں، کوئی دوسری قوم اس پر قبضہ نہیں کر سکتی*۔ یہ قومی ریاستیں کہلائیں جن کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ایک خاص جغرافیہ میں رہنے والے بلا امتیاز مذہب و نسل برابر کے شہری ہیں۔

اس لحاظ سے قومی ریاست ہماری فقہ کے لیے ایک نیا مظہر ہے۔ پہلے وقتوں میں جو ممالک مسلمان فاتحین فتح کرتے، اس میں غیر مسلم محکوم سمجھے جاتے تھے۔ وہ جو جزیہ اور خراج ادا کرتے تھے، وہ مسلمانوں کی ملکیت قرار پاتا تھا۔ قومی ریاستوں میں یہ حیثیت بدل گئی۔ چنانچہ جس طرح ایک غیر مسلم اکثریت میں رہنے والے مسلمان اپنے ہم قوم غیر مسلموں کے ساتھ برابر کے حقوق کے حق دار قرار پائے، اسی طرح مسلم اکثریت میں رہنے والے غیر مسلم، اپنے ہم قوم مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شہری قرار پائے۔ ان کے حقوق و فرائض میں کوئی فرق نہیں۔ سب پر یکساں طور پر ٹیکس کا نفاذ کیا جاتا اور بطور شہری ان کی شہری ضروریات ان سے پوری کی جاتی ہیں۔

چنانچہ کوئی قومی ریاست آئینی طور پر اس لیے مسلم ریاست نہیں بن جاتی کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ایسے ہی جیسے کوئی ریاست آئینی طور پر اس لیے مسیحی یا ہندو ریاست نہیں بن جاتی کہ وہاں مسیحیوں یا ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو یہ درست ہے کہ قیام پاکستان کی سیاسی تحریک کے دوران میں اسلام کا نعرہ استعمال کیا گیا تھا، لیکن ملک کی تشکیل قومی ریاست کے اصول پر ہی ہوئی تھی، جس میں مسلم اور غیر مسلم برابر کے شہری قرار دیے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ نے جو ووٹ پاکستان کے نام پر لیا، اس میں غیر مسلم کا ووٹ بھی شامل تھا اور یہ ووٹ مسلم ووٹ کے برابر تھا۔ مسیحیوں نے اسی اصول پر مسلم لیگ کو ووٹ دیا تھا۔

پاکستان کا قومی خزانہ صرف مسلمانوں کے پیسے سے جمع نہیں ہوتا، اس میں غیر مسلم کا ٹیکس بھی برابری کے اصول پر شامل ہے، نہ کہ جزیہ یا خراج کے نام پر محکومی کا ٹیکس۔ ٹیکس کی یہ رقم حاکم کی ملکیت نہیں، عوام کی ملکیت ہے اور حاکم اس کا منیجر ہے۔ وہ اس میں مالکانہ تصرف نہیں کر سکتا۔

---

* اس تقسیم میں جہاں جہاں تنازعات رہ گئے، ان میں سے کئی حل ہو چکے اور چند ابھی تک محل نزاع ہیں۔

اسلام آباد سمیت کوئی شہر بھی اس وجہ سے مسلمانوں کا تعمیر کردہ شہر نہیں کہلائے گا کہ اس وقت اس کی منظوری دینے والی اتھارٹی مسلمان تھی۔ وہ ایک قومی ریاست کا سربراہ تھا اور جو پیسا خرچ ہوا، وہ قومی خزانے کا پیسا تھا جس میں بلاامتیاز سب کے ٹیکسوں کا پیسا جمع تھا۔

اسی وجہ سے وزارت مذہبی امور صرف مسلم امور کو نہیں دیکھتی، سبھی مذاہب کی عبادت گاہوں کے بارے میں ایک ہی اصول پر عمل پیرا رہنے کی پابند ہے۔

ان بنیادوں پر قانونی پوزیشن یہ ہے کہ کسی بھی کمیونٹی کو اپنی عبادت گاہ بنانے کا حق آئینی طور پر حاصل ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز نہیں کی جاسکتی۔ ضرورت اور جواز کے ثبوت پر مسجد، مندر اور گرودوارہ سمیت کسی بھی دوسری عبادت گاہ کا قیام عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ جب تک قومی ریاست کا اصول آئینی طور پر تسلیم شدہ ہے، غیر مسلم عبادت گاہوں کے بارے میں اصولی پوزیشن یہی رہے گی۔ کعبہ اور حجاز کی تقدیس کے خصوصی احکام کا اطلاق بیرون حجاز نہ پہلے کبھی کیا گیا اور نہ اب کیا جاسکتا ہے۔

آئین میں صدر اور وزیر اعظم کے مسلم ہونے کی شرط اکثریت نے منظور کر لی ہے۔ اس استثنا کے علاوہ اور کوئی استثنا آئین میں مذکور نہیں، اس لیے مزید استثنا پیدا کرنے کا جواز بھی نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com

یہ سب کنفیوژن پاکستان کے بارے میں ایک مثالی اسلامی ریاست کے تصور کو قومی ریاست کے تصور سے گڈمڈ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ آئینی طور پر پاکستان تمام تر اسلامائزیشن کے باوجود اب تک ایک قومی ریاست ہے، جس پر نہ حجاز کے خصوصی احکام لاگو ہوتے ہیں اور نہ گذشتہ دور کے استبدادی ریاستوں کے فقہی احکام۔

جو علما قومی ریاست کے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے، انھیں پہلے اس آئینی صورت حال کو بدلنے کے لیے کوشش کرنا ہوگی، اس کے بغیر مندر یا گرودوارے کی تعمیر اور سہولت کاری پر حرمت کے فتاویٰ بے محل رہیں گے۔

ڈاکٹر حافظ خورشید احمد قادری*

کیا حفظ قرآن کریم کی تعلیمی اہمیت سے انکار ممکن ہے؟

آج سے ٹھیک ایک برس قبل جون ۲۰۱۹ء کے ماہنامہ ''اشراق'' میں ''قرآن مجید کے حفظ کی رسم پر نظر ثانی کی ضرورت'' شائع ہوا تو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، تابعین، تبع تابعین اور اسلاف علیہم الرحمۃ کی روایات کی پیروی کرنے والے سواد اعظم میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اگلے ہی ماہ جولائی ۲۰۱۹ء کے ''ضیائے حرم'' بھیرہ میں راقم کے قلم سے ایک مضمون ''حفظ قرآن کریم کی روایت پر نظر ثانی کی ضرورت؟ ایک فکری مغالطے کا ازالہ'' کے زیر عنوان سامنے آیا۔ اگرچہ یہ مضمون سب سے پہلے ماہنامہ ''اشراق'' کو ہی بھیجا گیا، لیکن اس علمی جریدہ کے ارباب حل و عقد نے اسے درخور اعتنانہ جانا۔ شاید ایک ماہ کے غور و تدبر (جو اہل اشراق کا طرۂ امتیاز ہے) کے بعد اگست ۲۰۱۹ء میں راقم کے مضمون کو (بزعم خود کچھ ضروری ترمیمات کے بعد) ''کیا قرآن مجید کے حفظ کی روایت پر نظر ثانی ہو سکتی ہے؟'' کے زیر عنوان شائع کیا۔ چونکہ بہت سی گرد اڑا دی گئی تھی، اس لیے بزرگ عالم دین اور وفاقی شرعی عدالت کے مشیر حافظ صلاح الدین یوسف (۱۹۴۵ء-۲۰۲۰ء) کے سلفیت کی بھرپور نمایندگی کرنے والے مضمون ''کیا حفظ قرآن کی ''رسم'' غیر ضروری اور بدعت ہے؟ غامدی گروہ کا ایک اور نہایت فتنہ انگیز شوشہ'' کو بھی ''اشراق'' کے صفحات پر جگہ دی گئی۔ قریباً تین صفحات پر مشتمل اپنے مضمون میں وفاقی شرعی عدالت کے مشیر نے پہلے ایک صفحے میں فراہی (۱۸۶۳ء-۱۹۳۰ء)، اصلاحی (۱۹۰۴ء-۱۹۹۷ء) اور غامدی گروہ کے خوب لتّے لیے، تین سوالات کے مختصر جوابات دیے اور

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

حفظ قرآن کی ترغیب میں چار احادیث نقل فرمائیں۔ ماہ اگست میں ڈاکٹر محمد امین (پ ۱۹۴۷ء) نے ماہنامہ ''البرھان'' میں ''حفظ قرآن کو بدعت کہنا گم راہ کن ہے، غامدی مکتب فکر کے ڈاکٹر عرفان شہزاد کا موقف تجدد کا شاہکار ہے'' کے عنوان سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ انھی دنوں مفتی محمد منیب الرحمٰن (پ ۱۹۴۵ء) نے بھی ''دنیا نیوز'' میں ''زاویۂ نظر'' کے کالم میں ''کیا حفظ قرآن بدعت ہے؟'' کے زیر عنوان دو اقساط میں ''اشراق'' کے مقالہ نگار کی آرا کا محاسبہ ادارتی صفحے پر کیا۔ اس کے بعد یوں معلوم ہوتا تھا کہ شاید جو گرد اڑادی گئی تھی، وہ بیٹھ چکی ہے۔ ''اشراق'' کے مقالہ نگار نے اپنی آرا سے رجوع کر لیا ہو گا، لیکن ٹھیک سال بعد جون ۲۰۲۰ء میں اسی مضمون نویس (پ ۱۹۷۶ء) نے ''ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی: دینی اور سماجی تناظر میں متعلقہ مسائل کا جائزہ اور تجاویز'' کے زیر عنوان جون ۲۰۱۹ء والی باتوں کو ہی ایک نئے انداز میں دہرایا ہے۔ اگر مقالہ نگار کی تحریر کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو وہ اپنے دعاوی کی خود ہی تردید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے کہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس طرح کے انسانیت سوز واقعات کے تعدد (frequency) کا تاثر غیر حقیقی ہے۔ اس حقیقت سے آپ نے یہ ایں الفاظ پردہ اٹھایا ہے:

> ''... ہر معلوم واقعہ کا سوشل میڈیا پر چرچا ہونا اسے زبان زد عام کر دیتا ہے۔ جس سے ان کے کثرت وقوع کا تاثر مزید مضبوط ہوتا ہے۔''[1]

ہمارا کہنا یہ ہے کہ جب اس جرم کی شرح وہی ہے، تو پھر اس واویلے کے کیا مقاصد ہیں؟ فاضل مقالہ نگار خود تسلیم کرتے ہیں کہ:

> ''... آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی شرح کم و بیش وہی ہے جو سماج میں ہمیشہ سے رہی ہے۔''[2]

ایک غیر حقیقی استنباط

''اشراق'' کے مقالہ نگار چونکہ خود ہی مدعی، خود ہی وکیل اور خود ہی منصف کا کردار سنبھالے ہوئے ہیں، اس لیے اسی زعم کے زیر اثر لکھتے ہیں:

> ''... جنسی زیادتی کے بعد قتل کے جرم کے علاوہ، مدارس دینیہ کا حصہ اس معاملے میں تناسب کے اعتبار

۱۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۳۶۔

۲۔ ایضاً۔

سے سب سے زیادہ ہے، جب کہ جنسی زیادتی کے بعد قتل کے واقعات زیادہ تر مدارس کے باہر کے جارحین کی طرف سے صادر ہوئے ہیں۔"[3]

درج ذیل بیان سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مقالہ نگار مدارس کے خلاف جیسے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ذرا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"... جارح کو زیادتی کا موقع کیسے ملتا ہے، اس تناظر میں والدین اور تعلیم گاہوں، خصوصاً مدارس —— جہاں یہ واقعات تسلسل سے پیش آتے ہیں —— کے کردار پر بحث کی گئی ہے۔"[4]

ایک جگہ آپ نے اسے ایک معاشرتی انسانی مسئلے کی حیثیت سے خود ہی تسلیم کیا ہے:

"... زیر بحث معاملہ میں کم زور فریق کم سن بچہ ہے، جو اپنے سے طاقت ور افراد (استاد، ہم سبق/ہم مکتب، قریبی رشتہ دار، محلے دار وغیرہ) کی حراست میں آجاتا ہے اور استحصال سے مراد جنسی زیادتی ہے۔"[5]

اس معاشرتی برائی اور انسانی المیہ کے وقوع کے امکانات کا اصول مقالہ نگار نے خود ہی بیان کر دیا ہے۔

"... طویل یا معتد بہ اوقات کے لیے کم سن بچوں کا متعلقہ طاقت ور اور بااختیار افراد کو دستیاب ہونا انھیں بچوں کے استحصال پر ابھارتا ہے۔ جسمانی تشدد اور جنسی زیادتی کے واقعات کا تناسب وہاں زیادہ ہو گا جہاں یہ امکانات زیادہ ہوں گے۔"[6]

یعنی اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں بھی مختلف عمروں کے لوگ جمع ہوں گے۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی یا اجتماعیت کا کوئی اور ادارہ وہاں اس کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تنقید کا نشانہ مدارس ہی کیوں؟

ٹیوشن سینٹر کے لیے مقالہ نگار کی تجویز

فاضل مقالہ نگار نے مذکورہ بالا —— بچوں کی جائے تدریس سے متعلق —— احتیاطی تدبیر پیش کرنے سے پہلے بالکل غور نہیں کیا کہ ہمارا معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ ہے۔ صدیوں سے یہاں جو نظام تعلیم رائج ہے

۳۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۳۷۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۳۸۔

۶۔ ایضاً۔

—— جس میں حفظ قرآن کریم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے —— اس میں نگرانی اور دیکھ بھال کے موثر ذرائع اختیار کیے گئے ہیں۔ مقالہ نگار کی تجویز ملاحظہ ہو: "... گھر میں اور ٹیوشن سنٹر میں تدریس کی جگہ ایسی ہونی چاہیے کہ مختلف اطراف سے نظر رکھی جاسکے۔"[7]

اس بات سے ہمارے معاشرے کے اکثر اہل نظر آگاہ ہیں کہ حفظ قرآن کی تعلیم کے لیے عام طور پر مساجد کے بڑے ہال یا مساجد کی کسی بڑی، کھلی، ہوادار اور روشن جگہ کو منتخب کیا جاتا ہے، جہاں ہر وقت لوگوں کی آمد ورفت رہتی ہے۔ ایک معاشرتی مرکز کی حیثیت سے محلے کے مسائل، تقاریب نکاح، وفات و جنازے کے اعلان اور پنچائیت کے حوالے سے مساجد میں اکثر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے تو پھر بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اس سے محفوظ جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔ ان سب حقائق کی موجودگی میں مقالہ نگار کا اپنی خود ساختہ رائے پر اصرار حیران کن ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"بچے سے زیادتی سے متعلق... امکانات سب سے زیادہ مدارس کے ماحول میں میسر ہیں... یہاں اس جرم کے وقوع کا تناسب دوسری جگہوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا تعجب انگیز نہیں ہے۔"[8]

ایک تعلیمی حقیقت

مقالہ نگار نے درست لکھا:

"... حفظ قرآن ایک بہت بڑی سعادت ہے، جس کے حصول کے لیے بہترین عمر بچپن کی ہے۔"[9]

"شعب الایمان" کی حدیث نے جس منزل کی طرف اشارہ کیا ہے، حفظ قرآن کریم اس منزل کے حصول کی جانب ایک پختہ قدم ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لحامل القرآن إذاعمل به، فأحل حلاله وحرم حرامه، يشفع في عشرة من أهل بيته يوم القيامة، كلهم قد

"اس حافظ قرآن کے لیے جو اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو، اس کی حلال کردہ اشیا کو حلال اور حرام کردہ اشیا کو حرام کرتا ہو، وہ اپنے گھرانے

۷۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۳۸۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۴۰۔

وجبت له النار.[10] | کے دس افراد، جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی، کی سفارش کرے گا۔‘‘

جوش تعصب میں یہاں مقالہ نگار کا قلم چوک گیا، لکھتے ہیں:

’’... جہنم کی آگ کا خطرہ دنیا کے کسی بھی خطرے کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔‘‘[11]

مقالہ نگار کی بیمار سوچ کا اظہار

’’... بچے کو ان تمام رشتوں ناتوں سے دور کسی باہر کے مدرسے میں بھیجا جائے، جہاں وہ کوئی شناسا نہ پائے اور یوں مختلف عمر اور مختلف علاقوں کے لڑکوں اور اساتذہ کے اجنبی ماحول میں وہ پوری توجہ سے قرآن مجید حفظ کرنے پر مجبور ہو جائے۔‘‘[12]

اس میں ’’مجبور ہو جائے‘‘ کے الفاظ مقالہ نگار کی بیمار ذہنیت کا شاخسانہ ہیں۔ اسلامی تاریخ میں بچے کی تربیت کے لیے گھر اور قریبی عزیزوں سے دور رضاعت اور ابتدائی تربیت کے لیے اجنبی ماحول میں بھیجا جانا سنت ہے۔ مغربی اقوام میں بورڈنگ اسکول کا تصور بھی تربیت کے اسی تصور کے گرد گھومتا ہے۔ بورڈنگ اسکول صرف وہی نہیں جہاں بہت بھاری فیسوں کی ادائیگی کی جاتی ہے، بلکہ وہاں چیریٹی (CHARITY) کے ادارے بھی بورڈنگ اسکول چلاتے ہیں۔ مقالہ نگار نے یہاں بھی اپنی مخصوص ذہنیت کی بدولت ایک اور صغریٰ کبریٰ بنایا ہے، اور مدارس میں کم سن بچوں کے داخلے کی ایک وجہ غربت کو قرار دیا ہے:

’’گھرانے کی کم آمدنی اور مفلسی بچوں کو مدارس میں داخل کرانے کی ایک بڑی وجہ ہے۔‘‘[13]

حقیقت یہ ہے کہ ہماری مادری زبان میں کہتے ہیں کہ ’’دنیا بھلیو بھلی‘‘، اس میں کوئی شک نہیں کہ غربت کی لکیر سے نیچے لوگوں کے بچوں کے لیے بھی مدارس جاے پناہ ہیں۔ جیسے فقہ حنفی کے بہت بڑے امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۳ھ-۱۸۲ھ) اسی کم سنی اور غربت کے دور میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۸۰ھ-۱۵۰ھ) کے ہاں حصول علم کے لیے لائے گئے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بہت سے پڑھے لکھے اور

۱۰۔ شعب الایمان ۲/۱۰۳۸۔

۱۱۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۴۱۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ ماہنامہ اشراق جون ۲۰۲۰ء، ۴۲۔

کھاتے پیتے گھرانے دینی علوم کے حصول کی خاطر باقاعدہ ایک منصوبہ بندی کے تحت اپنے بچوں کو حفظ قرآن کریم کی دولت کے حصول کے لیے گھر سے دور مدارس میں بھیجتے ہیں۔ راقم کے ہم جماعتوں میں سے ایک ساتھی ڈنگہ ضلع گجرات کے عطاء المصطفیٰ (پ ۱۹۵۹ء) میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ۱۹۷۶ء میں حفظ قرآن کریم کی دولت کے حصول کے لیے آئے۔ ایک سال سے بھی کم مدت میں حفظ مکمل کرکے انھوں نے اپنے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھا۔ ایم-اے کے فوراً بعد حکومت پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں لیکچرر کے طور پر گورنمنٹ زمیندارہ کالج گجرات میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈنمارک کے پاکستانی تارکین وطن نے ۱۹۹۱ء میں آپ کو اپنے نونہالوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے دعوت دی تو آپ ایک استاد اور مبلغ کے طور پر وہاں تشریف لے گئے۔ چند سالوں بعد ناروے میں مقیم اہل وطن نے یاد کیا تو آپ اردو، انگریزی، عربی، فارسی اور ڈینش زبانوں میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت کے ساتھ ناروے منتقل ہو گئے۔ ایک سال سے بھی کم مدت میں آپ نے نارویجین زبان میں بھی لکھنے اور بولنے کی صلاحیت میں مہارت کا درجہ حاصل کر لیا۔ اب پچھلے ۲۵ سال سے تبلیغ، تدریس اور تفہیم دین کے مقدس کام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ وہ اپنی تمام کامیابیوں کی بنیاد حفظ قرآن کریم کو قرار دیتے ہیں۔

ایک اور ساتھی، منڈی بہاؤالدین کے محمد سرفراز اختر مڈل کے امتحان میں پورے ضلع جہلم میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرکے حفظ قرآن کریم کے لیے آئے۔ قریباً ایک سال کی مدت میں حفظ مکمل کرکے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھا۔ آج وہ بھی اپنے علاقے منڈی بہاؤالدین کے ڈگری کالج میں حکومت پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے تحت اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

راقم (پ ۱۹۶۹ء) نے دس سال سے بھی کم عمری میں حفظ قرآن کریم کی دولت حاصل کی۔ تعلیمی سلسلہ الحمد للہ (پی-ایچ-ڈی) کے بعد بھی رکا نہیں۔ یورپ کے مختلف ممالک امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور بہت سے عرب ممالک کے ان گنت اداروں میں ہمارے حفظ کے ساتھی ہی امام، خطیب، استاد اور اسکالر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تین مرتبہ ترکی کے وزیر اعظم اور دو مرتبہ صدر منتخب ہونے والے رجب طیب اردگان (پ ۱۹۵۴ء) ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو انھیں اسکول داخل کرانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ انھیں ایک دینی مدرسے میں حفظ قرآن کریم کے لیے بھیج دیا گیا۔ اردگان نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ میری زندگی کی تمام

کامیابیاں حفظ قرآن کریم کی برکت سے ہیں۔ آپ کی کامیابیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ سید الایام جمعۃ المبارک کے بابرکت دن ۲۴ر جولائی ۲۰۲۰ء کو آیا صوفیہ میں ۸۶ برس بعد نماز جمعہ کا اہتمام بھی رب العزت نے اسی حافظ قرآن کی قسمت میں ہی لکھا تھا۔ وما توفیقی الا باللہ

مالدیپ کے تیس برس (۱۹۷۸ء-۲۰۰۸ء) صدر رہنے والے مامون عبد القیوم (پ ۱۹۳۷ء) دس برس کی عمر میں تعلیم کے لیے الازہر چلے گئے۔ آپ نے بھی الازہر کے نصاب کے مطابق حفظ قرآن کریم کی سعادت حاصل کی۔ دس برس کی عمر میں آپ کا اپنے گھر اور شہر نہیں، بلکہ وطن سے دور جانا، ایک نظام کے تحت حفظ قرآن کریم کی دولت حاصل کرنا، ''اشراق'' کے مقالہ نگار کی بہت سی غلط فہمیوں اور کج بحثیوں کا واضح جواب ہے۔

''اشراق'' کے مقالہ نگار نے چھوٹی عمر کے طالب علموں کے حوالے سے اپنے جن خدشات کا اظہار کیا ہے، وہ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر شخص کے ساتھ نہیں ہوتے۔ انسانی طبائع سے متعلق کہا جاتا ہے کہ Every Person is Unique in this World، یعنی اس دنیا میں جتنے انسان ہیں، خالق نے اتنی ہی طبائع پیدا کی ہیں۔ جہاں جہاں شیطان کی ذریت اپنا اظہار کرتی ہے، فاضل مقالہ نگار نے ایسے معدودے چند واقعات کو بہت مبالغے کے ساتھ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھے یا برے لوگ ہر جگہ اور ہر نظام میں موجود ہوتے ہیں۔ نہ بہت زیادہ اچھائی اور نیک نامی کی وجہ سے کسی نظام کو زندگی کے باقی نظاموں پر فوقیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ایک دو بری مثالوں کی وجہ سے کسی نظام کو لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ البتہ بہتری اور اصلاح کی گنجایش ہر شخصیت، ادارے، اور نظام میں موجود رہتی ہے، اس کے لیے ہر ذی شعور کو اپنی اپنی اہلیت کے مطابق کردار ادا کرنا چاہیے۔

مغربی تعلیم اور سوچ کے زیر اثر ''اشراق'' کے مقالہ نگار اس بات کو ایک نوحے کے طور پر بیان کر رہے ہیں کہ بچوں کی سال میں والدین سے ایک دو ہی ملاقاتیں ہو پاتی ہیں:

> ''... مدارس میں یہ کئی کئی ماہ اپنے بچوں کی خبر نہیں لیتے۔ بعض بچوں کی تو اپنے والدین سے سال میں ایک یا دو بار ہی ملاقات ہو پاتی ہے۔''[۱۴]

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے علما، ائمۂ فن اور محققین اپنی تعلیم کے لیے کئی کئی سال گھر سے دور رہ کر

۱۴۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۴۳۔

جدوجہد کرتے رہے۔ خود اصحاب صفہ کی عمروں، قبائل اور علمی استعداد میں جو تنوع تھا، اس سے اہل علم آگاہ ہیں۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے نوجوان اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ جیسے اطفال سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جیسے پختہ عمر کے صحابہ ایک ہی جگہ تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزرتے۔

مقالہ نگار خود تسلیم کرتے ہیں کہ مدارس کے نظام میں کسی بھی طرح کی بے ہودگی پر سخت سزا دی جاتی ہے، لیکن ان کے بقول جس چیز کی کمی ہے، وہ خاص طرح کی حساسیت ہے۔ فرماتے ہیں:

> ”... ایسا نہیں کہ مدارس میں اس کام کی کھلی چھٹی ہے، پکڑے جانے پر سخت سزا اور سرزنش کی جاتی ہے، لیکن اس معاملہ میں حد درجہ کم حساس ہونے کی بنا پر وہ ایسے اقدامات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جو ایسے واقعات کی روک تھام ممکن بنا سکیں۔“[15]

کالی بھیڑیں ہر شعبے، علاقے اور ادارے میں پائی جا سکتی ہیں۔ لاہور میں اشرافیہ کی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے معروف ادارے لاہور گرامر اسکول 1/1A گلبرگ غالب مارکیٹ کے پوش علاقے میں واقع ہے۔ سرخ ٹائلوں سے مزین اس کی شان دار عمارت اور اس میں پڑھنے والوں کی رنگا رنگ لمبی لمبی گاڑیاں اور پیجیرو زدیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے یہ چاند پر رہنے والی مخلوق ہے۔ ان کی ایک ایک ادا سے خوش حالی ٹپکتی ہے۔ ایک مشاہد یہ سوچ سکتا ہے: چونکہ یہ لوگ معاشی مسائل سے ناآشنا ہوتے ہیں، اس لیے ذہنی اور اخلاقی مسائل کبھی انھیں چھو کر بھی نہیں گزرے ہوں گے۔ ”اشراق“ کے مقالہ نگار کے بقول غربت، احساس احسان مندی اور عدم حساسیت کی وجہ سے —— حفظ قرآن کریم کے طلبا، اساتذہ، بڑی عمر کے ہم جماعتوں اور دیگر جارحین کے سامنے صدائے احتجاج بلند نہیں کر پاتے، اس لیے —— وہ ان کی ہوس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

معتبر انگریزی اخبار ”ڈیلی ٹائمز“ (Daily Times) کی ۲۹/ جون ۲۰۲۰ء کی رپورٹ اس حوالے سے چشم کشا ہے، جو درج ذیل عنوان سے شائع ہوئی:

Students Come Forward as Sexual Harassment Cases Rife in LGS

”لاہور گرامر اسکول میں بہ کثرت ہونے والے جنسی ہراسانی کے واقعات پر طالبات کا سامنے آنا۔“

۱۵۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۴۴۔

”اشراق“ کے مقالہ نگار کے بقول

”... مدارس کاروباری نفسیات سے آزاد ہوتے ہیں۔ عطیات اور چندے کے پیسوں سے مدارس کے اخراجات چلائے جاتے ہیں۔ تعلیم مفت ہے۔ مفت میں دی چیز احسان مندی کا تقاضا کرتی ہے اور احسان مند کا استحصال کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔“[16]

پیش نظر لاہور گرامر اسکول میں تعلیمی سال کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کو ربع (Quarter) کا نام دیا جاتا ہے۔ اسکالرشپ کے بغیر یہاں پڑھنے والے ہر طالب علم سے ایک ربع کی فیس ایک لاکھ روپے سے صرف دو ہزار کم، یعنی ۹۸۰۰۰ روپے لی جاتی ہے۔ اتنی بھاری بھرکم فیسوں اور اعلیٰ شعوری درجہ رکھنے والے اس اسکول سے متعلق اخلاقی حوالے سے ہوش ربا باتیں پچھلے کئی سالوں سے گردش میں رہی ہیں۔ لیکن وہاں پڑھنے پڑھانے والوں کے معاشرتی مقام کے پیش نظر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ روزنامہ ڈیلی ٹائمز کی ۲۹ / جون کو شائع ہونے والی رپورٹ پڑھنا شروع کی تو سچی بات ہے ایک استاد، ایک الفاظ و معانی سے آشنا فرد اور ایک باپ کی حیثیت سے حوصلہ بالکل جواب دے گیا۔ حقائق تک رسائی کے خیال سے بمشکل تمام اسے مکمل کیا تو جن حقائق سے آگاہی ہوئی، انھیں قلم پر لانا مشکل ہو گیا۔ نورالعین علی نے اشرافیہ کے اس اسکول برائے طالبات کی جن غیر اخلاقی باتوں کا ذکر کیا، وہ اسلامی مدارس اور ان کے نظام پر بے جا تنقید کرنے والوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں:

۱۔ اساتذہ اور دفتر کے ذمہ داران طالبات کے حوالے سے غیر مہذب اور غیر شائستہ زبان استعمال کرنے کے عادی ہیں۔

۲۔ نامناسب طریقے سے طالبات کے جسم کو دست گردی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

۳۔ تیرہ سے انیس سال (teenagers) کی طالبات کو اساتذہ اور دفتر کے ذمہ داران کی طرف سے تہذیب سے عاری تصاویر بھیجی جاتی ہیں۔

۴۔ ایک طالبہ نے ہیڈ مسٹریس سے شکایت کی کہ (رپورٹ میں بدمعاشوں کے نام لکھے ہیں، لیکن راقم یہاں ان ناموں کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتا) فلاں استاد کو آپ نے میرا ٹیوٹر کیوں مقرر کیا ہے، وہ تو ہر وقت میری چھاتی پر نظریں جمائے رکھتا ہے۔ میں کرسی پر بیٹھی ہوں تو میری کمر پر تھپکیوں کے بہانے ہاتھ پھیرتا ہے۔

۱۶۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۳۹۔

میں اس حرکت سے بچنے کے لیے اپنی کرسی پرے کرتی ہوں تو وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے آپ تو میری بیٹیوں کی طرح ہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ بہت بیمار ذہن کا آدمی تھا۔

کیمسٹری سائنس کا ایک اہم مضمون ہے۔ اس مضمون کے استاد بارے ایک طالبہ نے بتایا کہ وہ اکثر طالبات کی کمر پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔ طالبات میں سے ہر کوئی اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔ کیا کہوں، کیمسٹری کا استاد بہت بکواس انسان، بلکہ زیادہ درست یہ ہے کہ گندا آدمی تھا۔

لاہور اور پاکستان کے دیگر بڑے شہروں کے نام ور نجی (private) اسکولوں اور کالجوں کے طلبا و طالبات کو مستقبل کی سیاسی ذمہ داریاں اُٹھانے کے قابل بنانے کے لیے فرضی پارلیمان، یعنی Model یا Mock Parliament منعقد کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کسی بڑے شہر کے بڑے ادارے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پورے پاکستان سے طلبا و طالبات کی ایک بڑی تعداد اپنے اساتذہ کی زیر نگرانی اس میں شرکت کے لیے آتی ہے۔ مستقبل کے لیے حقیقی قیادت تیار کرنے کے لیے MUN (Model United Nations)، یعنی فرضی اقوام متحدہ کے اجلاس کسی بڑے تعلیمی ادارے میں منعقد کیے جاتے ہیں، جس میں مختلف اداروں سے آئے طلبا و طالبات کو ایک وفد کی شکل دے کر کسی ملک کی نمایندگی کے لیے کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں طرح کے اجلاس ایک خاص طرح کے ماحول میں کئی دنوں تک جاری رہتے ہیں۔

1A-LGS /1 کے ایک خوش شکل اور خوش گفتار استاد جو سیاسیات کی اعلیٰ ڈگری رکھتے ہیں، وہ Mock Parliament اور MUNs کے لیے کئی سالوں سے طلبا و طالبات کو وطن عزیز کے مختلف شہروں، حتیٰ کہ بیرون ملک بھی لے جاتے رہے ہیں۔ ان کے حوالے سے ایک طالبہ نے بتایا کہ میں ابھی اٹھارہ سال کی نہیں ہوئی تھی کہ MUN Coach نے مجھے اپنا دوست بنا لیا۔ جب میں نے اٹھارہ سال کا سنگ میل عبور کر لیا تو وہ مجھے ایک دن اپنی تنہائی میں لے گیا اور میری عصمت کا لبادہ اتار پھینکا۔ میں تو بچی تھی، ناتجربہ کار تھی، لیکن وہ تو بچہ نہیں تھا۔ اس سب کے باوجود میں اسے دوست ہی سمجھتی رہی۔ پھر یہ معمول بن گیا۔ میں طالبہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہی۔ ایک دن اپنی خواہش پوری کرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا: تم ٹھیک ہو نا؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ یہ سننا تھا کہ اس نے مجھے تھپڑ دے مارا۔ میں اپنے استاد کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے خاموش رہی۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس کی دست درازی پر میں نے کبھی انکار نہیں کیا، لیکن میں نے اسے کافی دفعہ بتایا کہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ چونکہ سب کچھ وہ محفوظ جگہ پر کرتا تھا، اس لیے اسے پروا نہیں

تھی کہ کوئی اسے پوچھے گا۔ اس نے یہ حقیقت مجھ پر واضح کر دی تھی۔ اس نے عمر میں مجھ سے چھوٹی بہت سی طالبات کی پاکیزگی کو بھی تباہ کیا تھا۔ وہ یہ سب کچھ مجھے بتاتا رہتا تھا۔ میری طرح کے تجربے سے گزرنے والی چار طالبات کو تو میں ذاتی طور پر جانتی ہوں۔

یہ MUN Coach کئی سالوں سے طالبات کو MUNs میں لے جا کر ان کی معصومیت سے کھیلتا رہا ہے۔ وہ شہر اور ملک سے باہر تعلیمی دوروں اور ہم نصابی سرگرمیوں کے مقابلوں کے اسفار میں الکوحل پیتا اور ہمیں (کم عمر بچیوں کو) پلاتا۔ ایک طالبہ کو اس نے اتنی الکوحل پلائی کہ وہ مدہوش ہو گئی تو پھر اس نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ دفتر میں اچھے عہدے پر فائز ایک معروف اداکار کی بیوی خاص طور پر اس طرح کے معاملات پر پردہ ڈالتی۔ ہم کئی سالوں تک دفتر میں شکایت کرتے رہے۔ وہ الٹا یہ کہہ کر ٹال دیتی:

These girls are shameless and go after a bachelor.

''یہ بے حیا لڑکیاں ایک کنوارے لڑکے کے پیچھے پڑی ہیں۔''

بین الاقوامی دوروں پر طالبات مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر ہوتیں تو وہ خاص طور پر انھیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتا۔ ہر کلاس میں وہ اپنے شکار کو تاڑ لیتا، لیکن بچیاں استاد کے احترام اور رعب کی وجہ سے کھلونا بنی رہتیں۔ بے بسی میں وہ اسے صرف پلے بوائے (Playboy) کہہ پاتیں۔ وہ سولہ سال سے کم عمر طالبات کا بھی لحاظ نہ کرتا۔ چھوٹی بچیوں نے کافی دفعہ اس کی شکایت کی، لیکن دفتر والوں نے کبھی بچیوں کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔

کیمسٹری کے استاد بارے ایک طالبہ نے بتایا کہ وہ ہمیشہ ہوس ناک نگاہوں سے طالبات کو تاڑتا رہتا۔ جسم کے مختلف حصوں پر بہانے بہانے سے ہاتھ لگا کر اذیت دیتا رہتا۔ ایک اور طالبہ نے بتایا کہ ایک مرتبہ تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر بہت قریب کیا اور بوسہ لیا۔ میں استاد کے سامنے بے بس تھی۔ پھر ایک دوست کی مداخلت سے میری جان چھوٹی۔ استاد کے اذیت ناک رویے کی وجہ سے میں نے اس کی کلاس پڑھنا چھوڑ دی، جس سے میں کیمسٹری میں بہت پیچھے چلی گئی۔ وہ طالبات سے بات کرتے ہوئے جان بوجھ کر اپنے مخصوص اعضا سے کھیلتا رہتا۔ دفتر کے ایک کارندے نے بھی اس بہتی گنگا سے صرف ہاتھ نہیں دھوئے، بلکہ کئی دفعہ اشنان کیا اور بہت سی معصوم کلیوں کو روندا۔ میں نے اپنے بھائی کو اس اذیت ناک احساس کا کچھ حصہ بتایا تو اس نے دفتر کے اس کارندے کو کھری کھری سنائیں، حالاں کہ میں ایسا نہیں چاہتی تھی، کیونکہ اس طرح میرا تعلیمی نقصان ہو سکتا تھا۔

اگر کوئی متاثرہ مظلوم لڑکی —— ایکٹر کی بیوی کے پاس —— دفتر میں شکایت لے کر جاتی تو وہ الٹاڈانٹنے لگتی کہ تم اپنے کپڑوں کا دھیان رکھا کرو۔ چست اور آدھے بازو والی قمیص پہن کر اسکول نہ آیا کرو، حالاں کہ ہم تو اسکول کا مجوزہ یونیفارم ہی پہن کر آیا کرتے۔ یہ کام LGS میں گذشتہ کئی سالوں سے جاری ہے۔ سوشل میڈیا پر بات آنے کے بعد بہت سی سابقہ طالبات نے اپنے بھیانک تجربات بلا کم و کاست بتا کر اسے ایک مکمل رپورٹ بنانے میں مدد دی۔ ایک سابقہ طالبہ نے بتایا کہ LGS کی پرنسپل اس گندے کاروبار کی سب سے بڑی سرپرست ہے۔ اسی لیے اپنے چار گناہ شریک دوستوں کے جانے پر وہ افسردہ ہے۔ پرنسپل نے دکھ اور نیک خواہشات کے ساتھ ان گندی مچھلیوں کو رخصت کیا۔ اس ساری قیامت کے بعد صرف چار شیاطین کو ایک غیر واضح الزام کا ذکر کر کے فارغ کیا گیا:

Terminated due to breach of Code of Conduct.

”ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی پر فارغ کر دیا گیا۔“

جب یہ معاملہ سوشل میڈیا پر آیا تو پانچ ہزار (۵۰۰۰) سے زیادہ سابقہ طالبات نے ان شیاطین کے خلاف ایک دستاویز پر دستخط کیے۔

ستم ظریفی

یہ سارا معاملہ ہی دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور کلیجے کو پاش پاش کرنے والے واقعات پر مشتمل ہے، لیکن جس انداز اور الفاظ کے ساتھ ان شیاطین کو فارغ کیا گیا، وہ اپنی جگہ ایک ستم ظریفی ہے۔ ان کا قصور صرف اتنا بتایا گیا کہ:

Breach of Code of Conduct.

”ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی۔“

ان بھیڑیوں کی درندگی کو کس قدر نرم الفاظ میں چھپا دیا گیا۔ ان کے Termination Letter کی زبان سے بھی پرنسپل اور انتظامیہ کا خبث باطن اور شیاطین کے لیے نرم گوشے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو مستقبل کے لیے نیک خواہشات سے بھی نوازا گیا ہے۔

اگلے دن ۳۰/ جون ۲۰۲۰ء کو روزنامہ ”DAWN“ نے اسی معاملے پر ایک تفصیلی مضمون شائع کیا:

Harassment Scandal as School in Lahore Raises Alarm Over Safety.

”جنسی ہراسانی کا اسکینڈل، لاہور کے ایک اسکول نے (طالبات کے عدم تحفظ پر) گھنٹی بجادی۔“

اس میں صاحب مضمون نے ”ڈیلی ٹائمز“ کی مضمون نگار نور العین علی کی تحقیق کے نکات کو دہرانے کے ساتھ بتایا کہ نظر بازی LGS-1A /1 کے مرد اساتذہ اور دفتر میں کام کرنے والوں کا عمومی وطیرہ ہے۔ یہاں اساتذہ اور اسٹاف کے بے ہودہ رویے کی شکایت کرنے والی طالبہ کو ہی بدنام کر دیا جاتا ہے۔ ”ڈان“ کے مضمون نگار کی رائے کے مطابق اس طرز کے تمام اسکولوں کا یہی حال ہے۔ ایک طالبہ نے صاحب مضمون کو بتایا کہ میں نے اساتذہ اور دفتری عملے کی بدنظری اور دست درازیوں سے بچنے کے لیے عبایا پہننا شروع کر دیا، لیکن بدنامی کے ڈر سے کسی کی شکایت نہیں کی۔ اس طرح کے بوائز اسکولوں کے طلبہ کے گروپ کرونا وبا کے ان دنوں میں بھی اجتماعی زیادتی کی مختلف کارروائیوں میں ملوث ہیں۔

محولہ بالا ساری رپورٹ پڑھتے اور اس کے کچھ حصوں کو اس تحریر کا حصہ بناتے ہوئے محسوس ہوا کہ تہذیب مغرب کے ان علم برداروں کے ہاتھوں انسانیت شرم سار اور تہذیب سر جھکائے کھڑی ہے۔ ”اشراق“ کے مقالہ نگار نے حفظ قرآن کریم کے مدارس —— جن کی بنیاد ہی تقویٰ اور خدمت دین کے جذبے پر رکھی جاتی ہے —— وہاں ذریت ابلیس کے در آنے والے اکا دکا نمایندوں کے کارناموں کو بنیاد بنا کر مدارس کے وجود، حفظ قرآن کریم کی ساڑھے چودہ سو سالہ روایت، اور ’اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ‘ (الحجر ۱۵:۹) سے مستنبط فرض کفایہ سے روگردانی کی بات تو کی، لیکن جہاں ایک، دو، چار، نہیں ان گنت معصوم کلیوں کو بھاری فیس لے کر بھی روند دیا جاتا ہے، ان سے متعلق ایک لفظ بھی ان کے قلم سے نہ نکلا۔ دو معتبر انگریزی اخبارات کی رپورٹ کے مطابق یہ انسانیت سوز عمل اشرافیہ کی طالبات کے لیے مخصوص اسکولوں میں ہوتا ہے تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وطن عزیز کی مستقبل کی قیادت جن گودوں میں پروان چڑھے گی، اشرافیہ کے یہ اسکول ان مقدس گودوں کو تقویٰ، معصومیت اور پاکیزگی سے محروم کر رہے ہیں۔

ایک لمحے کے لیے رک کر اگر غور کیا جائے کہ مغربی تہذیب کے علم بردار، ان اسکولوں سے تعلیمی حوالے سے کیا صلاحیت حاصل ہوتی ہے جس کے لیے یہ لوگ ۳۹۲۰۰۰ روپے سالانہ ادا کرتے ہیں۔ وہ صرف غلط سلط انگریزی زبان بولنے کی صلاحیت ہے۔ اس ایک صلاحیت کے حصول کے لیے اتنی بھاری فیس کے ساتھ عصمت، تہذیب، کردار اور حقیقی خود اعتمادی کی قربانی ایک مہنگا سودا ہے۔

دیکھو انھیں اگر دیدۂ عبرت نگاہ ہو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

"اشراق" کے مقالہ نگار اور محترم قارئین سے التماس ہے:

اب جس کے دل میں وہی پائے روشنی

ہم نے تو دل جلا کے سر عام رکھ دیا

مقالہ نگار کے بقول حفظ قرآن کریم ہر کسی کے لیے واجب نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

"... پورے قرآن مجید کا زبانی یاد کرنا واجب عمل نہیں ہے اور کسی غیر واجب کام کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔"[17]

اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں کہ حفظ قرآن کریم ہر مسلمان کے لیے واجب نہیں ہے، لیکن ایک طالب علم کے تعلیمی سلسلے کے اہم مرحلے کے طور پر اس کی اہمیت سے کسی صاحب عقل کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک جامعۃ الازھر کے شیخ الجامعہ کا یہ قول زبان زد عام ہے:

من لم يحفظ القرآن هو ليس بأزهري. "جو حفظ قرآن کریم کی دولت سے محروم ہے، وہ ازہری نہیں ہو سکتا۔"

الازہر کے نظام میں ہر مقامی طالب علم کے لیے پرائمری میں کچھ پارے یاد کرنا ضروری ہیں۔ ان حفظ شدہ پاروں کے امتحان میں کامیابی کے بغیر پرائمری سرٹیفکیٹ کا اجرا نہیں کیا جاتا۔ اجزائے قرآن کریم کی تعداد بڑھتے بڑھتے گریجویشن میں ۱۲ پارے اور پی۔ایچ۔ڈی تک پورا قرآن کریم حفظ کر کے اس کے امتحان میں کامیابی ایک لازمی تقاضا ہے۔ "اشراق" کے مقالہ نگار کے بقول تو یہ ایک غیر واجب عمل ہے اور کسی غیر واجب کام کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔[18]

ایک ہزار سال سے قائم یونیورسٹی کے ماہرین تعلیم جس چیز کو لازم قرار دے رہے ہوں، اگر کوئی ایک شخص اپنے تعصب، لاعلمی یا کسی خاص ایجنڈے کی ترویج کے لیے اسے غیر واجب قرار دے تو یقیناً اس کی رائے محترم نہیں رہتی۔

"اشراق" کے مقالہ نگار پنڈی وال ہیں اور پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد سے قریب ہیں۔ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی سے واقف ہوں گے۔ وہاں بھی ایم۔فل کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کوئی سے دو پاروں

۱۷۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۴۷۔

۱۸۔ ایضاً۔

کے زبانی امتحان میں کامیابی ضروری ہے۔ اسی طرح وہاں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لیے تین پاروں کے حفظ کے امتحان میں کامیاب ہونا لازم ہے۔

اگر حفظ قرآن کریم کا عمل اتنا غیر اہم ہوتا تو اس وقت ہزاروں کی تعداد میں یورپ اور امریکا میں مقیم مسلمانوں کے بچے آن لائن حفظ قرآن کریم کی دولت حاصل نہ کر رہے ہوتے۔

مقالہ نگار نے متن قرآن کی بے سمجھے تلاوت و حفظ قرآن کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے جو مثال پیش کی ہے، وہ حروف مقطعات الف-لام-میم کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''اس مفہوم کی حدیث سے بے سمجھ تلاوت و حفظ کے جواز پر استدلال سوء فہم ہے، جس میں ا-ل-م کی تلاوت پر تیس نیکیوں کی ضمانت دی گئی ہے۔ یہ طرز تکلم تشویق پیدا کرنے کے لیے ہے، نہ کہ بے سمجھ تلاوت کی ترغیب دینے کے لیے ا-ل-م کو بطور مثال ثواب کا حجم بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بات کسی طرح درست قرار نہیں دی جاسکتی کہ قرآن جس کا مقصد ابلاغ معنی ہے، اسے بے سمجھ پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔''[19]

یہاں اس نکتے کی جانب توجہ دلانا مقصود ہے کہ حدیث مبارکہ میں تین حروف کی تلاوت کے ثواب کی بات کی گئی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ الف-لام-میم کا شمار تو حروف مقطعات میں ہوتا ہے، جن کے معانی سے کسی کو واقفیت ہے بھی نہیں۔ یہاں ان حروف کی مثال ہی اس لیے دی گئی ہے تاکہ قرآن کریم کی مجرد تلاوت سے بھی اللہ رب العزت کی خوش نودی کو نمایاں کیا جاسکے۔

حروف مقطعات

قرآن کریم کی چند سورتوں کے شروع میں مذکور حروف مقطعات کے معانی و مفہوم سے متعلق پیر محمد کرم شاہ (۱۹۱۸ء-۱۹۹۸ء) نے لکھا: ''میرے نزدیک احسن قول یہ ہے کہ 'الم' اور دیگر حروف مقطعات 'سر بین اللہ ورسولہ'' ہے۔ یہ وہ راز ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ہیں۔''[20]

پیر صاحب کی رائے کا لب لباب یہ ہوا کہ حروف مقطعات کے معانی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی جانتے ہیں۔ اللہ اور رسول کے علاوہ سب کے لیے ان حروف کے معانی پردۂ خفا میں ہیں۔

۱۹۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۵۱۔

۲۰۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور ۱۹۹۵ء ۲۹/۱۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی (پ ۱۹۵۱ء) نے حروف مقطعات بارے اپنی راے یوں ظاہر کی ہے:

”...انھیں حروف مقطعات کہتے ہیں... یہ سورتوں کے نام ہیں۔ اِن کے معنی کیا ہیں؟ اِس باب میں سب سے زیادہ قرین قیاس نظریہ برصغیر کے جلیل القدر عالم اور محقق امام حمید الدین فراہی کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف تہجی چونکہ اصلاً عرب قدیم میں رائج وہی حروف ہیں جو صرف آواز ہی نہیں بتاتے تھے، بلکہ چینی زبان کے حروف کی طرح معنی اور اشیا پر بھی دلیل ہوتے تھے اور جن معانی یا اشیا پر دلیل ہوتے تھے، انھی کی صورت پر لکھے بھی جاتے تھے۔“[۲۱]

غامدی صاحب نے خط تمثالی (Pictography) کے نظریے پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اس بیان کو ”البیان“ کی چوتھی جلد میں بھی دہرایا ہے۔[۲۲]

جاوید غامدی تو اپنے اس نقطۂ نظر سے آگے نہ بڑھ سکے، لیکن امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴ء-۱۹۹۷ء) نے اس حوالے سے کوئی قطعی بات کہنے سے معذوری ظاہر کی ہے اور اس پر ایک منطقی بحث کے بعد کچھ نتائج اخذ کیے ہیں۔

اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

”...چونکہ الگ الگ کر کے پڑھے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔... یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔... ان ناموں کے معانی کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا بڑا مشکل ہے۔“[۲۳]

اصلاحی صاحب بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ان حروف کے معانی کی جستجو کو غیر اہم قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”...جب ایک شے کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ نام ہے تو پھر اس کے معنی کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کیونکہ نام سے اصل مقصود مسمیٰ کا اس نام کے ساتھ خاص ہو جانا ہے، نہ کہ اس کے معنی۔“[۲۴]

قرآن کریم کی تفہیم کے حوالے سے حروف مقطعات کے معانی کی جستجو کو کارلاحاصل قرار دیتے ہوئے

۲۱-البیان ۱/ ۲۶۔

۲۲-البیان ۴/ ۱۳۔

۲۳-تدبر قرآن ۱/ ۸۲۔

۲۴-تدبر قرآن ۱/ ۸۳۔

آپ فرماتے ہیں:

"... کم از کم فہم قرآن کے نقطۂ نظر سے ان ناموں کے معانی کی تحقیق کی تو کوئی خاص اہمیت ہے نہیں۔"[25]

مذکورہ حروف کے معانی کی تلاش میں جن علما و محققین نے اپنی اٹکل یا جستجو کے گھوڑے دوڑائے، اصلاحی صاحب اسے بے فائدہ قرار دیتے ہیں۔

"... بہت سے پچھلے علمانے ان ناموں پر غور کیا اور ان کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی جستجو سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔"[26]

اصلاحی صاحب نے ان حروف کی تحقیق کو مستحسن، لیکن ان کے معانی تک انسانی علم کی نارسائی اور قرآنی علم کی ناقابل بیان اور ناقابل تصور گہرائی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"... اگر اس کوشش سے کوئی حقیقت واضح ہوئی تو اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہو گا اور اگر کوئی بات نہ مل سکی تو اس کو ہم اپنے علم کی کوتاہی اور قرآن کے اتھاہ ہونے پر محمول کریں گے۔"[27]

تلمیذ فراہی کی درج ذیل رائے تو علوم انسانی، فہم انسانی اور ادراک انسانی کے حدود کا واضح تعین کر دیتی ہے۔ قرآنی حروف کے معانی تک انسانی علم و فہم کی نارسائی کو بھی وہ قرآن کے معجزے سے تعبیر کرتے ہیں:

"اپنے علم کی کمی اور قرآن کے اتھاہ ہونے کا یہ احساس بجائے خود ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس احساس سے علم و معرفت کی بہت سی بند راہیں کھلتی ہیں۔ اگر قرآن کا پہلا ہی حرف اس عظیم انکشاف کے لیے کلید بن جائے تو یہ بھی قرآن کے بہت سے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہو گا۔ یہ اسی کتاب کا کمال ہے کہ اس کے جس حرف کا راز کسی پر نہ کھل سکا اس کی پیدا کردہ کاوش ہزاروں سربستہ اسرار سے پردہ اٹھانے کے لیے دلیل راہ بنی۔"[28]

اصلاحی صاحب نے اس سلسلے میں مسلمان علما کی چودہ سو سالہ کاوشوں کو کسی مضبوط بنیاد سے محروم اور ناقابل ذکر گردانا ہے:

"ان حروف پر ہمارے پچھلے علمانے جو رائیں ظاہر کی ہیں ہمارے نزدیک وہ تو کسی مضبوط بنیاد پر مبنی نہیں

۲۵۔ تدبر قرآن ۱/ ۸۳۔

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ ایضاً۔

۲۸۔ ایضاً۔

ہیں۔ اس وجہ سے ان کا ذکر کرنا کچھ مفید نہیں ہو گا۔“[29]

صاحب ”تدبر قرآن“ نے فراہی صاحب کی رائے کو بیان ضرور کیا، لیکن غامدی صاحب کی طرح اسے حرف آخر نہیں، بلکہ جادۂ تحقیق کی ایک کرن قرار دیا ہے:

”... استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ... سے اصل مسئلہ اگرچہ حل نہیں ہوتا، لیکن اس کے حل کے لیے ایک راہ کھلتی ضرور نظر آتی ہے۔“[30]

اصلاحی صاحب اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بھی صاحب ”نظام القرآن“ کی رائے کو ایک غیر حتمی نظریے سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں:

”... میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ ... اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہو گا۔“[31]

سید مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) بھی ان حروف کے مفہوم پر غور و تدبر اور تحقیق و جستجو کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”... ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنی نہ جانے گا تو اس کے راہ راست پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا۔ لہٰذا ایک عام ناظر کے لیے کچھ ضروری نہیں کہ وہ ان کی تحقیق میں سر گرداں ہو۔“[32]

پانچ صاحب طرز اور مختلف الرائے (غامدی صاحب اپنے استاذ امام سے اور اصلاحی صاحب امام فراہی سے اختلافی آرا رکھتے ہیں) مفسرین قرآن —— حمید الدین فراہی، سید مودودی، امین احسن اصلاحی، پیر محمد کرم شاہ، جاوید احمد غامدی —— میں سے تین اس رائے سے متفق ہیں کہ حروف مقطعات کے معانی تک انسانی علم، فہم اور تحقیق کی رسائی نہیں ہے۔ راقم اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہے کہ حدیث مبارکہ میں حروف مقطعات کی مثال اسی لیے دی گئی تاکہ ثابت ہو سکے کہ قرآن کریم کی مجرد تلاوت بھی اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کا باعث ہے۔

۲۹۔ تدبر قرآن ۱/ ۸۳۔

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ تدبر قرآن ۱/ ۸۵۔

۳۲۔ تفہیم القرآن ۱/ ۴۹۔

حدیث مبارکہ: ’’تزوجوا الودود الولود، إني مكاثر الأنبياء يوم القيامة‘‘[۳۳] کے ترجمہ میں مقالہ نگار نے —— زیادہ کے بجائے قابل فخر بچے پیدا کرنے کا —— جو تکلف کیا ہے اور معنوی تحریف کا ارتکاب کیا ہے، اہل علم اس سے آگاہ ہیں۔ پھر اگلے ہی پیراگراف میں اپنے پچھلے بیان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’اگر آپ [صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] نے آبادی بڑھانے کی ترغیب میں درج بالا ارشاد فرمایا تھا تو یہ قرین قیاس ہے۔‘‘[۳۴]

حال ہی میں گورنر پنجاب کی صدارت میں —— جو بربنائے عہدہ صوبے کی تمام جامعات کے چانسلر بھی ہیں —— وائس چانسلرز کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں اتفاق رائے سے یہ تجویز منظور کی گئی کہ جامعۃ الازہر اور انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی طرز پر پنجاب کی تمام جامعات میں قرآن کریم کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ راقم کا خیال ہے کہ مقالہ نگار نے اپنے تئیں اس تجویز کے ثمرات کو ہوا میں اڑا دینے کے لیے زیر نظر مضمون کے ذریعے سے ایک زوردار آندھی چلانے کی کوشش کی، لیکن ہمارا یقین ہے کہ:

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۳۔ مسند احمد، الرسالہ ۲۰/ ۶۳۔

۳۴۔ ماہنامہ اشراق، جون ۲۰۲۰ء، ۵۲۔

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

(۲)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت ابوہریرہ اور عہد خلافت کے معرکے

جنگ خندق کے موقع پر خندق کی کھدائی میں ایک سفید چٹان حائل ہو گئی جو صحابہ سے نہ ٹوٹی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود خندق میں اترے اور تین ضربوں میں اسے پاش پاش کر دیا۔ تینوں بار آپ کی ضرب سے تیز روشنی نکلی۔ آپ نے فرمایا کہ اس چمک میں میں نے حیرہ، مدائن، روم اور صنعا کے محلات دیکھے، مجھے جبریل نے بتایا کہ میری امت ان محلات کو فتح کرے گی۔ آپ کی پیشین گوئیوں کا منافقین نے (معاذ اللہ) مذاق اڑایا۔ عہد فاروقی اور خلافت عثمانی میں یہ محلات مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے تو حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: جو شہر تمھارے سامنے آئے، زیر کر لو۔ اس اللہ کی قسم جس کے قبضے میں ابوہریرہ کی جان ہے، قیامت تک جتنے شہر تم فتح کرو گے، ان کی کنجیاں محمد صلی اللہ علیہ سلم کو پہلے ہی عطا کی جا چکی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جامع اور فصیح کلمات کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے اور دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال کر مجھے فتح دلائی گئی ہے۔ میں سویا ہوا تھا کہ زمین کے خزانوں کی کنجیاں میرے ہاتھ پر رکھ دی گئی

ہیں۔ حضرت ابوہریرہ نے یہ حدیث روایت کرنے کے بعد کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے رب کے پاس جا چکے، اب تم ان خزانوں کو کھود کر نکال رہے ہو (بخاری، رقم ۲۹۷۷۔ مسلم، رقم ۱۱۶۸۔ نسائی، رقم ۳۰۸۷۔ احمد، رقم ۷۵۷۵۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۳۶۳)۔

بنو امیہ سے تعلق

بنو امیہ سے تعلق کا مطلب یہ نہ تھا کہ حضرت ابوہریرہ ان کے تابع مہمل تھے۔ وہ ان کو نصیحت کرتے اور ان کی غلطیوں پر ٹوکتے۔

حضرت حسن کی وفات پر مروان نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں ان کی تدفین کرنے سے روکا تو انھوں نے اسے جھاڑ دیا اور کہا: تم معاویہ کو خوش کرنے کے لیے بلاوجہ جھگڑا کر رہے ہو۔ ابن حجر کہتے ہیں: وہ اس وقت مدینہ کا گورنر نہیں تھا۔

۵۰ھ میں حضرت معاویہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور عصا کو یہ کہہ کر مدینہ سے شام منتقل کرنا چاہا کہ یہ حضرت عثمان کے قاتلوں کے تصرف میں ہیں۔ انھوں نے حضرت سعد قرظ سے عصاے نبوی مانگا اور منبر کو ہٹایا تو سورج مکمل گرہن میں چلا گیا۔ مدینہ کے آسمان پر تارے نظر آنے لگے۔ لوگ خوف زدہ ہو گئے، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابوہریرہ آئے اور کہا: امیر المومنین، یہ مناسب نہیں کہ آپ منبر رسول کو اس کی جگہ سے ہٹائیں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا، آپ کے عصا کو بھی شام لے کر نہ جائیں۔ اس طرح تو مسجد نبوی ہی منتقل کر دیں گے۔ حضرت معاویہ نے اپنا منصوبہ ترک کر دیا۔ انھوں نے منبر میں چھ سیڑھیاں بڑھا دیں اور اپنی کارروائی پر معذرت کی۔

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ مروان کے گھر گئے اور وہاں ٹنگی ہوئی تصاویر دیکھ کر اسے تنبیہ کی (مسلم، رقم ۵۵۴۳۔ احمد، رقم ۷۱۶۶)۔

حضرت ابوہریرہ نے مروان سے پوچھا: تم نے بیاج کی بیع حلال قرار دے دی ہے؟ اس نے کہا: میں نے ایسا کب کیا؟ تم نے پروانہ یا تحریر (document) کے ذریعے سے سودا کرنا جائز ٹھیرایا، حالاں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ دینے سے پہلے غلہ فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس پر مروان نے لوگوں سے خطاب کیا اور اس طرح خرید و فروخت کرنے سے روک دیا۔ حدیث کے راوی سلیمان بن یسار کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ اہل کار لوگوں کے ہاتھوں سے ان کی دستاویزات چھین رہے تھے (مسلم، رقم ۳۸۴۹)۔

حضرت ابوسعید خدری کا سماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ساٹھ سال کا عرصہ گزرنے کے بعد ایسے ناخلف لوگ سامنے آئیں گے جو نماز ضائع کریں گے اور شہوات کی پیروی کریں گے۔ ان کے بعد کے لاخیرے قرآن کی تلاوت کریں گے، لیکن وہ ان کی ہانسوں سے نیچے نہ اترے گا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ مدینہ کے بازار سے گزرتے اور دعا کرتے جاتے: اللہ، مجھے ۶۰ھ تک زندہ نہ رکھنا؛ اے اللہ، مجھے لڑکوں کی حکومت نہ دکھانا (البدایہ والنہایہ ۸/ ۱۱۴)۔

دور اموی میں حضرت ابوہریرہ مسجد نبوی میں مروان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے فرمایا: میں نے سچے اور سچا یقین کیے جانے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن رکھا ہے: میری امت کی تباہی قریش کے کچھ (نادان) نوجوانوں کے ہاتھوں ہو گی۔ مروان نے کہا: ان نوجوانوں پر لعنت ہو۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں وضاحت کر سکتا تھا: فلاں کے بیٹے، فلاں کی اولاد۔ حدیث کے راوی عمرو بن یحییٰ کہتے ہیں: جب بنو مروان کی شام میں حکومت قائم ہوئی تو میں اپنے دادا سعید بن عمرو کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ میرے دادا نے ان لڑکوں بالوں کو دیکھ کر کہا: ہو سکتا ہے، یہ وہی نوجوان ہوں (بخاری، رقم ۷۰۵۸۔ مسلم، رقم ۷۴۳۱۔ احمد، رقم ۸۰۰۵)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تعلق

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے 'یا ابا هرّ' کہہ کر پکارتے اور لوگ ابوہریرہ کہتے (بخاری، رقم ۶۲۰۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۱۴۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۸۱۳۰۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۷۳۸۷)۔ حضرت ابوہریرہ لوگوں کو بھی کہتے تھے کہ مجھے ابوہرّ کی کنیت سے بلاؤ۔ نر مادہ سے بہتر ہوتا ہے (مستدرک حاکم، رقم ۶۱۴۴)۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: میں تین سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔ مجھے اس سے زیادہ کسی بات کی حرص نہ ہوتی تھی کہ آپ کے ہر فرمان کو ذہن نشین کر لوں۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت ابوہریرہ کی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رفاقت چار برس رہی (طبقات ابن سعد ۴/ ۳۲۷)۔ ذہبی کہتے ہیں: یہ صحیح تر ہے، اس لیے فتح خیبر سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک چار سال کا عرصہ بنتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ نے ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: میں نوجوان ہوں اور گناہوں کے اندیشے میں مبتلا رہتا ہوں۔ میرے پاس اتنے وسائل نہیں کہ کسی خاتون سے شادی کر سکوں۔ آپ خاموش رہے،

انھوں نے دوبارہ اور سہ بارہ کہا تو بھی آپ نے سکوت فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ نے چوتھی بار گزارش کی (اور خصی ہونے کی اجازت چاہی) تو ارشاد کیا: ابوہریرہ، تم خصی ہو یا نہ ہو جو تقدیر میں ہے، لکھا جا چکا اور اس پر قلم خشک ہو چکا ہے (بخاری، رقم ۵۰۷۶۔ نسائی، رقم ۳۲۱۵۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۶۸۱۴۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۳۸۴۷)۔

ایک بار حضرت ابوہریرہ نے اپنی کتان (linen، باریک سوتی کپڑا) کی رنگی ہوئی قمیص سے ناک صاف کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واہ واہ، کیا کہنے، ابوہریرہ کتان سے ناک پونچھتا ہے (بخاری، رقم ۷۳۲۴۔ ترمذی، رقم ۲۳۶۷۔ شعب الایمان، بیہقی، رقم ۱۰۶۸۹۔ طبقات ابن سعد ۴/ ۳۳۴۔ حلیۃ الاولیاء، رقم ۱۳۰۶)۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ میں کھجوریں بانٹیں۔ آپ نے ہر ایک کو سات کھجوریں عنایت فرمائیں۔ مجھے دی جانے والی کھجوروں میں سے ایک خشک اور سخت تھی، لیکن مجھے وہی سب سے اچھی لگی، کیونکہ میں اسے دیر تک چباتا رہا (بخاری، رقم ۵۴۱۱)۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ کو سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی ہدایت فرمائی (بخاری، ابواب الوتر: ۲۔ ترمذی، رقم ۴۵۵)۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی نصیحت کی اور فرمایا: انھیں مرتے دم تک سفر و حضر میں نہ چھوڑنا: ہر ماہ کے تین روزے، چاشت کے نوافل اور وتر پڑھ کر سونا (بخاری، رقم ۱۱۷۸۔ مسلم، رقم ۱۶۷۳۔ ابوداؤد، رقم ۱۴۳۲۔ ترمذی، رقم ۷۶۰۔ احمد، رقم ۷۵۱۲)۔ دوسری روایات میں چاشت کے نوافل کے بجاے جمعہ کے دن غسل کرنے کا ذکر ہے (احمد، رقم ۷۱۳۸۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۲۱۹)۔

حضرت ابوہریرہ کا حافظہ

ایک بار حضرت ابوہریرہ نے عرض کیا: یارسول اللہ، میں جو کچھ سنتا ہوں، بھول جاتا ہوں۔ فرمایا: میں جب کچھ کہہ رہا ہوں تو تم اپنا جبہ پھیلا دو اور جب کلام ختم کر دوں تو اپنے گرد لپیٹ لو۔ حضرت ابوہریرہ نے آپ کے اس فرمان پر عمل کیا تو آپ سے سماع کردہ کوئی بات نہیں بھولے (بخاری، رقم ۳۶۴۸)۔ دوسری روایت میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک جماعت سے فرمایا: جو آج اپنی چادر پھیلا لے گا، میری کوئی بات نہ بھولے گا۔ تب حضرت ابوہریرہ نے اپنی چادر بچھائی اور آپ کے ارشادات سن کر اپنے سینے سے لگا لی (بخاری، رقم ۷۳۵۴۔ مسلم، رقم ۶۳۹۹۔ ابن ماجہ، رقم ۲۶۲۔ احمد، رقم ۷۲۷۵۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۲۴۱۔

حلیۃ الاولیاء، رقم ۱۳۱۷)۔ ایک روایت میں ہے: حضرت ابوہریرہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مزاج پرسی کے لیے گئے تو وہاں حضرت علی موجود تھے۔ آپ نے ابوہریرہ کو پاس بٹھا کر نصیحت فرمائی کہ جمعہ کے دن غسل کر کے نماز کے لیے جلد آ جانا، ہر ماہ تین روزے رکھنا اور فجر کی رکعتوں کی حفاظت کرنا۔ پھر آپ نے ان کا کپڑا اپنے قریب کر کے انھیں سینے سے لگانے کو کہا۔

حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوہریرہ علم کا ذخیرہ (اصل: 'وعاء' بمعنی برتن) ہیں (مستدرک حاکم، رقم ۶۱۵۹)۔ کعب کہتے ہیں: میں نے ابوہریرہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا جس نے تورات نہیں پڑھی، پھر بھی تورات کے علوم کو خوب جانتا ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں: ابوہریرہ اپنے زمانے کے رواۃ حدیث میں سب سے زیادہ حافظہ رکھتے تھے۔

ایک دفعہ مروان نے حضرت ابوہریرہ کے حافظے کا امتحان لیا۔ اس نے حضرت ابوہریرہ کو بلا کر احادیث سنانے کو کہا۔ پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا مروان کا کاتب ابوزعیزعہ سن کر لکھتا جا رہا تھا۔ سال بھر کے بعد مروان نے یہی عمل دہرایا۔ اس نے دیکھا کہ دو مختلف اوقات میں حضرت ابوہریرہ کی املا کرائی ہوئی احادیث میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں (مستدرک حاکم، رقم ۶۱۶۴)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تعلیم حدیث و فقہ

حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر حضرت ابوہریرہ سے احادیث دریافت کرتے۔ حضرت ابوایوب انصاری نے حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت بیان کی تو سننے والے نے کہا: آپ بھی تو صحابی رسول ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: ابوہریرہ نے یہ ارشاد رسول سن رکھا ہے، بہتر ہے کہ میں انھی کے واسطے سے آگے سناؤں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابوہریرہ اور حضرت جابر بن عبداللہ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد، اپنی وفات تک مدینہ میں فتویٰ دیتے اور احادیث بیان کرتے رہے۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے طلاق کا مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس یا حضرت ابوہریرہ کے پاس بھیج دیا۔ حضرت ابن عباس نے حضرت ابوہریرہ سے رابطہ کرنے کو کہا۔ ذہبی کہتے: امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک نے کئی مسائل میں قیاس کو ترک کر کے حضرت ابوہریرہ کی روایات پر فتاویٰ دیے۔

کچھ اصحاب کو حضرت ابوہریرہ کے تفقہ پر اعتراض تھا۔ امام شافعی کہتے ہیں: حفظ حدیث کے باوجود

حضرت ابوہریرہ کو افضل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نسیان

حضرت ابوہریرہ کے نسیان کی بھی ایک مثال ملتی ہے۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: ابوہریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنایا کہ ''کوئی شخص اپنے بیمار اونٹوں کو کسی کے صحت مند اونٹوں میں نہ لے جائے'' تو ان کے چچا زاد حارث بن ابوذباب نے کہا: آپ یہ روایت بھی تو بیان کیا کرتے تھے: چھوت لگنے کی کوئی حقیقت نہیں اور بدشگونی کی کوئی اصل نہیں۔ حضرت ابوہریرہ نے یہ ماننے سے انکار کر دیا اور جب حارث نے تکرار کی تو غصے سے حبشی زبان بولنا شروع کر دی۔ حضرت ابوسلمہ کہتے ہیں: میں نے ابوہریرہ کو اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث بھولتے نہیں دیکھا، کیا پتا کہ وہ بھولے نہ ہوں، بلکہ پہلا حکم اس فرمان نبوی سے منسوخ ہو گیا ہو (بخاری، رقم ۵۷۷۱۔ مسلم، رقم ۵۷۹۱۔ ابوداؤد، رقم ۳۹۱۱)۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں حضرت ابوہریرہ صفہ میں مقیم رہے، پرانے اور نئے آنے والے اہل صفہ کی نگہداشت کرتے۔ آپ ان مساکین کی ضروریات پوری کرتے، انھیں جمع کرتے یا کھانے کی دعوت دیتے تو حضرت ابوہریرہ سے کہتے۔ آپ کی وفات کے بعد ان کی زندگی مدینہ میں حدیث کی تعلیم دیتے ہوئے گزری۔

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے ایک بازار (بنوقینقاع) گیا۔ آپ واپس ہوئے تو میں بھی ساتھ تھا۔ (حضرت فاطمہ کے گھر پہنچے تو) آپ نے تین دفعہ پکارا: 'لُکَع' (بچو نگڑا کہاں ہے)؟ حسن بن علی کو بلاؤ۔ حسن آئے، ان کی گردن میں لونگ کا ہار تھا۔ آپ نے دست مبارک پھیلایا، حسن نے بھی ہاتھ بڑھایا، پھر آپ نے انھیں ساتھ لپٹا لیا اور دعا فرمائی: 'اے اللہ، میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے اور ان لوگوں سے محبت کر جو اسے چاہتے ہیں'' (بخاری، رقم ۵۸۸۴۔ مسلم، رقم ۶۲۵۷)۔

حضرت ابوہریرہ بتاتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک باغ سے گزر رہے تھے کہ باغ کو سیراب کرنے والے اونٹ نے آپ کو دیکھا اور اپنی گردن جھکا کر زمین سے لگا لی۔ اصحاب نے کہا: اس اونٹ سے زیادہ ہمیں آپ کو سجدہ کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ آپ نے فرمایا: سبحان اللہ، کسی بشر کے لیے جائز نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرے۔ اگر اس کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں: مجھے قبیلہ بنو تمیم سے ہمیشہ محبت رہی، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: میری امت میں سے بنو تمیم دجال کے لیے سخت رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ بنو تمیم کی ایک جنگی قیدی عورت حضرت عائشہ کو ملی تو آپ نے فرمایا: اسے آزاد کر دو، یہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہے۔ بنو تمیم کے صدقات مدینہ پہنچے تو آپ نے فرمایا: یہ میری قوم کے صدقات ہیں (بخاری، رقم ۲۵۴۳۔ مسلم، رقم ۶۴۵۱۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۱۰۱)۔

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے کسی راستے میں حضرت ابوہریرہ کو دیکھا، لیکن وہ پیچھے مڑ کر نکل گئے۔ واپس آئے تو آپ نے پوچھا: ابوہریرہ، کہاں رہ گئے تھے؟ بتایا: میں جنبی تھا، بغیر غسل کے آپ کے پاس بیٹھنا برا لگا۔ فرمایا: سبحان اللہ، مومن پلید نہیں ہوتا (بخاری، رقم ۲۸۳۔ مسلم، رقم ۸۲۴۔ ابوداؤد، رقم ۲۳۱۔ ترمذی، رقم ۱۲۱۔ احمد، رقم ۷۲۱۱)۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلا جاتے تو میں ڈونگے یا کسی برتن میں پانی لا کر آپ کو دیتا۔ آپ استنجا کر لیتے تو میں دوسرے برتن میں پانی لاتا جس سے آپ وضو کرتے (بخاری، رقم ۳۸۶۰۔ ابوداؤد، رقم ۴۵)۔ حضرت ابوہریرہ بتاتے ہیں: ایک بار آپ رفع حاجت کے لیے نکلے، میں پیچھے چل رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: پتھر ڈھونڈ لاؤ، ہڈی یا لید نہ لانا۔ میں نے اپنی قمیص کے کنارے سے روڑے پکڑے اور آپ کے پہلو میں رکھ کر پیچھے ہٹ آیا (بخاری، رقم ۱۵۵)۔

حضرت ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے شہداے احد کی قبور پر حاضری دیتے۔

فرامین رسالت کے ابلاغ کا عزم

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں کھونٹی گاڑنے سے نہ روکے۔ یہ ارشاد نبوی بیان کرنے کے بعد حضرت ابوہریرہ فرماتے تھے: کیا وجہ ہے کہ تم اس حکم پر عمل کرنے سے گریزاں ہو، میں یہ فرمان نبوی تمھیں بار بار زور دار طریقے سے سناتا ہی رہوں گا (اصل: تمھارے کندھوں کے درمیان مارتا رہوں گا) (بخاری، رقم ۲۴۶۳۔ مسلم، رقم ۴۱۳۰۔ ابوداؤد، رقم ۳۶۳۴۔ ترمذی، رقم ۱۳۵۳۔ احمد، رقم ۷۲۷۸۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۲۴۲)۔

حضرت ابوہریرہ نے ایک عورت کو دیکھا کہ خوشبو اس سے پھوٹ رہی تھی اور چادر کا پلو غبار اڑا رہا تھا۔ انھوں نے پوچھا: اے خداے جبار کی باندی، مسجد سے آ رہی ہو اور خوشبو چھڑک رکھی ہے؟ اس کے ہاں کہنے پر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہا: میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: اس عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی جو اس مسجد میں خوشبو لگا کر آئے، حتیٰ کہ لوٹ کر جنابت والا غسل نہ کر لے (ابوداؤد، رقم ۴۱۷۴۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۳۷۸)۔

حضرت ابوہریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: قیامت کے دن آپ کی شفاعت کی سعادت سب سے زیادہ کسے حاصل ہو گی؟ تو آپ نے فرمایا: ابوہریرہ، مجھے یہی خیال تھا کہ سب سے پہلے یہ سوال تم ہی مجھ سے کرو گے، اس لیے کہ میں نے تم میں علم حدیث کی حرص دیکھ لی تھی۔ روز حشر میری شفاعت سے سب سے زیادہ فیض یاب وہ ہو گا جس نے خلوص دل سے 'لا إلٰہ إلا اللّٰہ' کہا ہو گا (بخاری، رقم ۹۹۔ احمد، رقم ۸۸۵۸)۔

طفاوہ قبیلے کے ایک بزرگ مدینہ میں حضرت ابوہریرہ کے مہمان ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی کو مہمانوں کے معاملے میں ابوہریرہ سے زیادہ چاق وچوبند اور خاطر مدارات کرنے والا نہیں پایا۔ ایک دن وہ اپنی چارپائی پر بیٹھے تھے، میں بھی پاس تھا۔ ایک تھیلی میں کنکریاں یا گٹھلیاں بھری تھیں، ابوہریرہ گٹھلی نکالتے، اس پر تسبیح پڑھ کر نیچے پھینک دیتے۔ تھیلی خالی ہوئی تو انھوں نے نیچے بیٹھی ہوئی کالی کلوٹی لونڈی کو تھما دی، اس نے گٹھلیاں دوبارہ بھر کر ان کو واپس کر دی۔ انھوں نے تھیلی پکڑی اور احادیث رسول بیان کرنا شروع کر دیں (ابوداؤد، رقم ۲۱۷۴)۔

کثرت روایت سے پیدا ہونے والی بدگمانیاں

حضرت ابوہریرہ پہلے شخص تھے جنھوں نے حدیث روایت کرنا شروع کی۔ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین سال رہا۔ اپنی پوری عمر مجھے حدیث یاد کرنے کا اتنا شوق کبھی نہیں ہوا جتنا ان تین سالوں میں تھا (بخاری، رقم ۳۵۹۱)۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں: وہ پہلے راوی ہیں جن پر تہمت لگی۔

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں: اصحاب رسول میں مجھ سے زیادہ حدیث روایت کرنے والا کوئی نہ تھا، سوائے عبداللہ بن عمرو (عمر: ابن حجر) کے، کیونکہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا (بخاری، رقم ۱۱۳۔ احمد، رقم ۷۳۸۹)۔

ان کے اپنے قول سے پتا چلتا ہے کہ کثرت سے احادیث بیان کرنے کی وجہ سے لوگ ان کے متعلق کیا گمان کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا: سنو، تم میرے بارے میں چہ مگوئیاں کرتے ہو کہ میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھتا ہوں، اس لیے کہ تم راہ یاب ہو جاؤ اور میں گم راہ ہو جاؤں (مسلم، رقم ۵۴۹۷)۔ مزید فرمایا: اگر کتاب الٰہی کی یہ دو آیات نہ ہوتیں تو میں کبھی حدیث رسول بیان نہ کرتا: 'اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالۡہُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَیَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ'، ''بے شک جو ہماری اتاری ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں بعد اس کے ہم کتاب الٰہی میں انھیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر چکے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والے (فرشتے یا انسان) لعنت بھیجتے ہیں'' (البقرہ ۲: ۱۵۹) (بخاری، رقم ۱۱۸۔ مسلم، رقم ۲۴۹۲۔ احمد، رقم ۷۲۷۶)۔

حضرت عائشہ نے اپنے بھانجے عروہ سے کہا: تمھیں ابوہریرہ پر تعجب نہ ہوا، میرے حجرے کے پاس بیٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے اور 'اے حجرے کی مالکن' کہہ کر مجھے سنانے لگے۔ میں نوافل پڑھ رہی تھی، میرے فارغ ہونے سے پہلے ہی اٹھ گئے۔ اگر مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ملتا تو بتاتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی طرح لگاتار کلام نہیں کرتے تھے۔ آپ اس طرح کلام فرماتے تھے کہ کوئی بھی آپ کے ارشادات کو شمار کر کے یاد کر سکتا تھا (مسلم، رقم ۶۳۹۹۔ ابوداؤد، رقم ۳۶۵۵۔ ترمذی، رقم ۳۶۳۹۔ احمد، رقم ۲۴۸۶۵)۔ دوسری روایت ہے کہ آپ کی گفتگو ایسی صاف ہوتی تھی کہ ہر سننے والا سمجھ جاتا تھا (ابوداؤد، رقم ۴۸۳۹)۔ شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے حدیث روایت کرنے پر نہیں، بلکہ پے در پے، جلدی جلدی احادیث بیان کرنے پر اعتراض کیا، کیونکہ اس طرح ان کا سمجھ میں آنا اور ذہن نشین ہونا مشکل ہو سکتا ہے۔ ابن حجر نے اس اعتراض کو اس طرح رفع کیا کہ حضرت ابوہریرہ کے پاس وسیع ذخیرۂ احادیث تھا، ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ رک رک کر، ٹھیر ٹھیر کر روایت کرتے۔

ایک بار حضرت عائشہ نے حضرت ابوہریرہ کو بلا کر پوچھا کہ وہ حدیثیں کون سی ہیں جو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیان کرتے ہو؟ تم نے بھی وہی سنا جو ہم نے سنا اور وہ دیکھا جو ہم نے دیکھا۔ انھوں نے کہا، اماں جان، آپ سرمہ، آئینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بناؤ سنگھار میں مصروف رہتی تھیں۔ مجھے، بخدا، ایسی کوئی مصروفیت نہ تھی جو آپ کے ارشادات سے غافل کرتی (مستدرک حاکم، رقم ۶۱۶۰)۔ حضرت عائشہ نے کہا: ہو سکتا ہے یہ بات ہو (ابن عساکر)۔

حضرت عبداللہ بن عمر کو پتا چلا کہ حضرت ابوہریرہ یہ حدیث بیان کر رہے ہیں: ''جو جنازے میں شامل ہوا

اور نماز جنازہ پڑھنے تک موجود رہا، اسے ایک قیراط اجر ملے گا اور جو تدفین تک شامل رہا، دو قیراط اجر پائے گا“ (بخاری، رقم ۷۴۔ مسلم، رقم ۲۱۸۹۔ ابوداؤد، رقم ۳۱۶۸۔ احمد، رقم ۱۸۸۷۔ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۶۶۳۳)، تو کہا: ابوہریرہ، آپ نے ہمیں بہت احادیث سنائی ہیں اور انھیں پکڑ کر حضرت عائشہ کے پاس لے گئے۔ حضرت عائشہ نے اس روایت کی تصدیق کی (مسلم، رقم ۲۱۹۴۔ ابوداؤد، رقم ۳۱۶۹۔ ترمذی، رقم ۱۰۴۰) تو انھیں کہنا پڑ گیا: ہم نے تو کئی قیراط کھو دیے، آپ ہم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، اس لیے ہم سے زیادہ آپ کی حدیثوں کو جانتے ہیں (مستدرک حاکم، رقم ۶۱۶۷)۔ یہ روایت بیان کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہ نے قیراط کے معنی احد کے برابر یا اس سے بھی بڑا پہاڑ بتائے، قیراط (carat) ہیرے جواہرات کا وزن کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اس سیاق میں یہ ۲۰۰ ملی گرام کے برابر ہوتا ہے اور ۵ قیراط ایک گرام کے مساوی ہوتے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے پوچھا: ہم ابوہریرہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ باتیں سنتے ہیں جو آپ سے نہیں سن پاتے۔ حضرت طلحہ نے جواب دیا: ہم گھر بار، مال مویشی اور دھندوں والے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صبح یا شام کے وقت حاضر ہوتے۔ ابوہریرہ مسکین تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر مہمان بن کر پڑے ہوئے تھے، اس لیے ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے وہ ارشادات سماع کیے ہوں جو ہم نہیں کر سکے۔ ہم میں سے کوئی ان پر جھوٹ کا الزام نہیں لگاتا (ترمذی، رقم ۳۸۳۷۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۱۷۲)۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: تم سمجھتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار احادیث روایت کرتا ہے (گویا جھوٹ بولتا ہے)۔ اللہ حساب لینے والا ہے۔ میں اصحاب صفہ میں شامل ایک مسکین شخص تھا، کھا پی کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چپکا رہتا۔ میرے مہاجر بھائیوں کو بازاروں میں بیع و شرا مشغول رکھتی تھی اور انصار کو ڈھور ڈنگروں کے کام پڑے رہتے تھے۔ جب انصار و مہاجرین موجود نہ ہوتے، میں آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا، چنانچہ وہ کچھ یاد کر لیتا جو ان کے ذہنوں میں نہ ہوتا (بخاری، رقم ۱۱۸۔ مسلم، رقم ۶۳۹۷۔ احمد، رقم ۷۲۷۵۔ سنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۵۸۶۸۔ حلیۃ الاولیاء، رقم ۱۳۰۵)۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ سے پوچھا: تم ان غنیمتوں کا تقاضا کیوں نہیں کرتے جو تمھارے ساتھی مانگتے ہیں؟ حضرت ابوہریرہ نے کہا: آپ مجھے وہ علم سکھا دیجیے جو اللہ نے آپ کو عطا کر رکھا ہے (حلیۃ الاولیاء، رقم ۱۳۱۸)۔

حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت پر نقد کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: ابوہریرہ بہ کثرت احادیث بیان کر کے اپنے اوپر بہت ذمہ داری لے لیتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا: کیا آپ ان کی کسی روایت کو غلط بھی قرار دیتے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں، تاہم وہ جرأت سے کام لیتے ہیں اور ہم بزدلی دکھا جاتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ کو ان کا تبصرہ معلوم ہوا تو کہا: میرا کیا گناہ اگر میں یاد رکھتا ہوں اور وہ بھول جاتے ہیں (ابوداؤد، رقم ۱۲۶۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۱۶۵)۔ حضرت ابی بن کعب کہتے ہیں: حضرت ابوہریرہ جرأت سے کام لیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ باتیں پوچھ لیتے تھے جو کوئی اور نہ پوچھتا تھا۔ مثلاً انھوں نے سوال کیا: آپ نے امر نبوت میں سب سے پہلے کیا دیکھا؟ اس پر آپ متوجہ ہو کر بیٹھ گئے اور پہلے شق صدر کا واقعہ بیان فرمایا (احمد، رقم ۲۱۲۶۱۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۱۵۵۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۱۶۶)۔

حضرت زبیر بن عوام کہتے ہیں کہ مجھے ابوہریرہ کے سماع میں کوئی شک نہیں، لیکن کبھی وہ قول رسول کو اس کے محل سے ہٹا کر بیان کر دیتے ہیں۔

حضرت عمر نے حضرت ابوہریرہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کثرت سے احادیث بیان کرنے پر کئی بار تنبیہ کی اور کہا: میں تمھیں دوس کی سرزمین میں واپس بھیج دوں گا۔ ان کا خیال تھا کہ لوگوں کی توجہ احادیث پر مرکوز ہو گی تو وہ ان سے غلط مطلب نکالیں گے، رخصتیں ڈھونڈیں گے اور قرآن سے غافل ہو جائیں گے۔ ایک دفعہ انھوں نے حضرت ابوہریرہ کو بلا کر پوچھا: ایک بار تم ہمارے ساتھ فلاں صحابی کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے۔ حضرت ابوہریرہ نے جواب دیا: ہاں، مجھے معلوم ہے کہ آپ نے یہ کیوں مجھ سے پوچھا ہے۔ حضرت عمر نے کہا: کیوں پوچھا ہے؟ حضرت ابوہریرہ بولے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن فرمایا تھا: جس نے جان بوجھ کر مجھ سے جھوٹ منسوب کیا، اپنا ٹھکانا جہنم بنا لے (بخاری، رقم ۱۱۰۔ احمد، رقم ۹۳۱۶۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۱۱۶)۔ حضرت عمر نے کہا: اب کوئی رکاوٹ نہیں، جا احادیث بیان کر۔

حضرت ابوہریرہ کی چند روایات

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں غزوۂ ہند (میں فتح) کی خوش خبری دی ہے۔ اگر میں نے اس میں شرکت کر کے شہادت پائی تو اعلیٰ شہید شمار پاؤں گا اور اگر زندہ لوٹ آیا تو ابوہریرہ کاتب (یا محدث) ہی رہوں گا (بخاری، رقم ۲۹۲۴۔ احمد، رقم ۱۲۸۰۷۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۱۷۷)۔ احمد کی روایت میں 'سندو ہند' کے الفاظ ہیں۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: میں نے ابن ام سلیم (خادم رسول حضرت انس بن مالک) کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا کہ اس کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے زیادہ مشابہ ہو۔ نہار (رحال) بن عنفوہ ایک بار حضرت ابوہریرہ اور حضرت فرات بن حیان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پاس سے گزرے۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے ایک کی ڈاڑھ جہنم میں احد پہاڑ سے بڑی ہو گی۔ آپ کی پیشین گوئی پوری ہوئی، رحال مسیلمہ کذاب کے ساتھ مرتد ہوا، قرآن مجید سے اس کے ادعاے نبوت کے دلائل پیش کرتا اور حالت ارتداد میں، یمامہ کی جنگ میں حضرت زید بن خطاب کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دس صحابہ سے فرمایا: تم میں سے جو آخر میں وفات پائے گا، آگ میں جائے گا۔ ان دس میں حضرت ابوہریرہ، حضرت سمرہ بن جندب اور حضرت ابومحذورہ شامل تھے۔ یہ تینوں برابر ایک دوسرے کی خبر رکھتے رہے، حتیٰ کہ حضرت ابومحذورہ کا انتقال ہو گیا۔ اب حضرت ابوہریرہ اور حضرت سمرہ بن جندب کو فکر لگی رہتی۔ کوئی حضرت ابوہریرہ کو تنگ کرنا چاہتا تو کہتا کہ سمرہ وفات پا گئے ہیں، وہ یہ سن کر بے ہوش ہو جاتے۔ آخر کار، حضرت ابوہریرہ فوت ہوئے اور حضرت سمرہ اکیلے رہ گئے۔ بیہقی کہتے ہیں: یہ سب روایات ضعیف اور منقطع ہیں۔ ان پر اس لیے بھی یقین نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حضرت سمرہ مخلص صغار صحابہ میں سے تھے۔ کچھ علماے حدیث کہتے ہیں کہ حضرت سمرہ بن جندب کی وفات حضرت ابوہریرہ کی وفات کے ایک سال بعد ۵۹ھ میں ایک حادثے میں آگ (یا ابلتے پانی) میں جلنے سے ہوئی، یہی ارشاد نبوی کا منشا تھا (الاستیعاب: سمرہ بن جندب)۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: ہم کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے تھے، ابوبکر و عمر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اچانک آپ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ آپ کی واپسی میں دیر ہوئی تو ہمیں فکر ہوئی۔ سب سے پہلے میں گھبرا کر اٹھا اور آپ کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا انصار کے قبیلہ بنونجار کے باغ جا پہنچا، کوئی دروازہ نظر نہ آیا تو باہر موجود کنویں سے باغ کو سیراب کرنے والے نالے کے ذریعے سے اندر جا پہنچا۔ وہاں آپ کو موجود پایا، آپ نے پوچھا: ابوہریرہ، کیا معاملہ ہے؟ میں نے بتایا کہ آپ اٹھ کر آ گئے اور لوٹنے میں تاخیر کی تو ہمیں اندیشہ ہوا کہ دشمن آپ کو ہم سے جدا دیکھ کر نہ ستائیں۔ میں پریشان ہو کر اٹھ آیا، دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ فرمایا: ابوہریرہ، (مجھ سے ملاقات کے ثبوت کے طور پر) یہ میری جوتیاں لو، اس باغ کے باہر جو بھی تمھیں دل سے یقین رکھتے ہوئے لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دیتا نظر آئے، اسے جنت کی بشارت دے دو۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں: سب سے پہلے میرا سامنا عمر سے ہوا، انھوں نے پوچھا: ابوہریرہ، یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ میں نے جواب دیا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دے کر فرمایا: جو بھی دل سے یقین رکھتے ہوئے لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دے، اسے جنت کی بشارت دے دوں۔ عمر نے میرے سینے پر زور سے ہتھڑ مارا جس سے میں پیٹھ کے بل گر گیا اور مجھے واپس چلنے کو کہا۔ میں بسورتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوٹا، عمر بھی آن پہنچے اور عرض کیا: یارسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، میں ڈرتا ہوں کہ لوگ اس خوش خبری پر تکیہ کر بیٹھیں گے۔ آپ نے فرمایا: اچھا، ان کو عمل کرنے دو (مسلم، رقم ۱۴۷)۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون مجھ سے یہ باتیں سیکھ کر ان پر خود عمل کرے گا اور دوسروں کو سکھائے گا؟ حضرت ابوہریرہ نے جواب دیا: میں، یارسول اللہ، آپ نے ان کا ہاتھ تھام کر نصیحت فرمائی: ابوہریرہ، شبہات سے بچتے رہو، عابد بن جاؤ گے؛ محرمات سے دور رہو، زاہد ہو جاؤ گے؛ اپنے پڑوسی سے اچھا سلوک کرو، مسلمان ہو جاؤ گے؛ لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، مومن بن جاؤ گے (مسند ابویعلیٰ، رقم ۵۸۵۸)۔ دوسری روایت میں ہے: جو اللہ نے تمھاری قسمت میں لکھا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ تو خوب مال دار ہو جاؤ گے، زیادہ مت ہنسنا، کیونکہ یہ دل کو مردہ کر دیتا ہے (احمد، رقم ۸۰۹۵۔ ترمذی، رقم ۲۳۰۵۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۷۰۵۴)۔

حضرت ابوہریرہ پودا لگا رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پاس سے گزرے۔ فرمایا: اس سے بہتر بھی ایک پودا ہے، تمھیں اس کے بارے میں نہ بتاؤں؟ ایک بار 'سبحان الله، والحمد لله، ولا إله إلا الله، والله أكبر' کہنے سے جنت میں تمھارا ایک درخت لگ جائے گا (ابن ماجہ، رقم ۳۸۰۷)۔

کعب الاحبار اور حضرت ابوہریرہ

کعب یہودی عالم تھا، اس نے حضرت عمر کے عہد خلافت میں اسلام قبول کیا۔ حضرت عمر نے ان کی بعض روایتوں کی تحسین کی، لیکن تنبیہ بھی کی کہ تم پہلے زمانے کی باتیں بیان کرنا چھوڑ دو، نہیں تو میں تمھیں بندروں کی سرزمین میں پہنچا دوں گا۔ حضرت ابوہریرہ کعب سے تورات کے مسائل دریافت کرتے تھے۔ حضرت معاویہ کہتے ہیں: کعب الاحبار اگرچہ اہل کتاب کی روایتیں نقل کرنے والوں میں سب سے زیادہ سچے ہیں، اس کے باوجود ہمیں ان کے جھوٹ کا تجربہ ہوا ہے (بخاری، رقم ۷۳۶۱)۔ کئی بے سروپا اور باطل باتیں ان سے منقول ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اللہ نے ہفتے کے روز مٹی، اتوار کے دن

پہاڑ، پیر کے روز درخت، منگل کے دن مکروہات، بدھ کو نور، جمعرات کو چوپایے اور جمعہ کے روز عصر سے رات تک کی آخری گھڑیوں میں حضرت آدم کو تخلیق کیا (مسلم، رقم ۷۰۵۴۔ احمد، رقم ۸۳۴۱)۔ طبری نے اس روایت کو مرجوح قرار دیا ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں: کعب الاحبار نے اپنے صحیفوں سے پڑھ کر یہ قول حضرت ابوہریرہ کو سنایا، کسی راوی کو وہم ہوا اور اس نے اسے مرفوع روایت سمجھ لیا۔

حضرت بسر بن سعید کہتے ہیں: حدیث کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ میں نے دیکھا کہ ابوہریرہ نے چند احادیث رسول اور کعب الاحبار کے کچھ اقوال سنائے۔ ان کی مجلس ختم ہوئی تو ان سے سماع کرنے والے ایک شخص نے حدیث رسول کو قول کعب اور کعب کے قول کو حدیث رسول بنا ڈالا۔

حدیث میں حضرت ابوہریرہ کے تصرفات

الحاق کا شبہ

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی زناکار زنا کرتے ہوئے مومن نہیں ہوتا، کوئی چور حالت ایمان میں چوری نہیں کرتا، نہ کوئی شرابی بادہ خواری کرتے ہوئے ایمان سے متصف ہوتا ہے۔ ابوبکر بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: ابوہریرہ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے یہ فقرہ بڑھا دیتے تھے: ایک ڈاکو عوام کی نگاہوں کو متوجہ کرنے والا ڈاکا ڈالتے ہوئے ایمان سے خارج ہوتا ہے (مسلم، رقم ۲۰۲۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۳۵۷)۔

ملا دینے (یا بڑھا دینے، اصل میں 'الحاق') کے الفاظ سے یوں لگتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ ایک مرفوع روایت میں غیر مرفوع قول کا پیوند لگا رہے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں۔ یہ بات دوسرے طرق سے واضح ہو جاتی ہے۔ سنن دارمی میں حضرت ابوہریرہ ہی کی روایت (رقم ۲۰۳۰) ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی ڈاکو ایسا بیش قیمت ڈاکا ڈالتے ہوئے، جس کی طرف اہل ایمان کی نگاہیں اٹھیں، دائرۂ ایمان میں نہیں ہوتا۔ مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت (رقم ۲۲۷۶۳) حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ڈاکو ایسا بیش قیمت ڈاکا ڈالتے ہوئے، جسے اہل ایمان سر اٹھا کر دیکھیں، مومن نہیں ہوتا۔

کبھی حضرت ابوہریرہ روایت بیان کرنے کے بعد اپنا تبصرہ کر دیتے ہیں یا کسی اور کا قول نقل کر دیتے ہیں لیکن یہ 'قال أبو هريرة' کی وضاحت سے ممیز ہوتا ہے۔ اس کی مثال وہ روایت (بخاری، رقم ۲۷۸۔ مسلم، رقم ۷۷۰۔ احمد، رقم ۸۱۷۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۹۵۹) ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ

بیان کیا گیا ہے۔ وہ نہا رہے تھے کہ پتھر ان کے کپڑوں سمیت لڑھک گیا (اصل: پتھر کپڑے لے دوڑا)۔ انھوں نے کپڑے پکڑنے کے بعد پتھر کو مارنا شروع کر دیا۔ روایت مکمل ہونے کے بعد حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں: واللہ، پتھر پر حضرت موسیٰ کی چھ یا سات ضربوں کے نشانات ہیں۔ شارحین مسلم نے اس کے سوا کچھ نہیں بتایا کہ یہ ایک اثر ہے، جب کہ ابن حجر کہتے ہیں: یہ حضرت ابوہریرہ کا قول ہے۔

تدلیس

اگرچہ حضرت ابوہریرہ صدق، دیانت اور زہد کے عظیم منصب پر فائز تھے، تاہم شعبہ بن حجاج کہتے ہیں کہ انھوں نے کچھ روایتوں میں تدلیس سے کام لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان مسموع روایتوں کی طرح سنانا اگرچہ اسے خود نہ سنا ہو۔ شعبہ نے حضرت ابوہریرہ کی اس روایت کا حوالہ دیا: جس نے حالت جنابت میں صبح کر دی، اس کا روزہ نہ ہو گا۔ جب ان سے اس کی اصل پوچھی گئی تو بتایا کہ میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی، کسی نے مجھے بتایا ہے۔ مسلم کی روایت ۲۵۸۹ میں ہے کہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور عبدالرحمٰن بن حارث نے حضرت ابوہریرہ سے یہی روایت سنی تو امہات المومنین حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ سے استفسار کرنے گئے۔ دونوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت جنابت میں صبح ہو جاتی تھی اور آپ ایسے ہی روزہ رکھ لیتے تھے۔ اب یہ دونوں مروان کے اصرار پر حضرت ابوہریرہ کے پاس پہنچے اور انھیں امہات المومنین کا مشاہدہ بتایا۔ حضرت ابوہریرہ نے پوچھا: کیا انھوں نے یہ کہا ہے؟ اثبات میں جواب ملنے پر کہا: وہ بہتر جانتی ہیں۔ پھر بتایا کہ میں نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں، بلکہ فضل بن عباس سے سنی ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوہریرہ نے یہ روایت بیان کرنا چھوڑ دی۔

ذہبی کہتے ہیں: صحابہ میں تدلیس عام ہے، وہ اپنے سے بڑے صحابی کا نام ذکر نہیں کرتے، عادل ہونے کی وجہ سے ان کی روایت مانی جاتی ہے۔

مبالغہ فی العمل

حضرت ابوہریرہ بعض اوقات فرامین نبوی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مبالغے کی اس حد تک پہنچ جاتے جو شاید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہوتا نہ آپ کی طرف سے اس کا تقاضا کیا گیا ہوتا۔ مثلاً یہ روایت کہ حضرت ابوہریرہ نے وضو کرتے ہوئے بازو سیدھا کیا، حتیٰ کہ اسے بغل تک دھو ڈالا۔ ان کے شاگرد ابوحازم نے جو پیچھے کھڑے دیکھ رہے تھے، پوچھا: یہ کیسا وضو ہے؟ انھوں نے کہا: او ابوالعجم فروخ کی اولاد، مجھے پتا ہوتا کہ تو یہاں ہے تو وضو

اس طرح نہ کرتا۔ میں نے اپنے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: روز قیامت مومن کو وہاں تک زیور پہنایا جائے گا جہاں تک اس کا وضو پہنچا (مسلم، رقم ۵۸۶۔ نسائی، رقم ۱۴۹۔ احمد، رقم ۸۸۴۰۔ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۶۱۹۵)۔

ابراہیم نخعی حضرت ابو ہریرہ کی وہی احادیث نقل کرتے تھے جن میں جنت دوزخ کا ذکر ہوتا۔ ذہبی کہتے ہیں: ان کے اس عمل کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ مسلمان قدیم سے اب تک ان کی روایات کو درست اور محکم جانتے آئے ہیں۔ حضرت عائشہ نے حضرت ابو ہریرہ کی کئی روایات کی تاویل کی اور کچھ کو ان کا وہم قرار دیا۔

حدیث ابو ہریرہ پر مہمل اعتراض

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے تلف کرنے کا حکم دیا ہے، سوائے شکاری کتے، بکریوں کے گلے کے کتے اور اس کتے کے جو جانوروں کی حفاظت کرتا ہو۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے پوچھا گیا: ابو ہریرہ تو کھیت کے کتے کو بھی مستثنیٰ کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، ان کی کھیتی باڑی ہے (مسلم، رقم ۴۰۱۹۔ ترمذی، رقم ۱۴۸۸)۔ تقی عثمانی کہتے ہیں: ہمارے دور کے ملاحدہ نے حضرت ابن عمر کے اس تبصرے کو بنیاد بنا کر صحت احادیث میں شک کرنا شروع کر دیا، حالاں کہ حضرت ابو ہریرہ کا بیان کردہ ٹکڑا ان سے (مسلم، رقم ۴۰۳۰)، حضرت سفیان بن ابو زہیر (مسلم، رقم ۴۰۳۶) اور خود حضرت عبد اللہ بن عمر (مسلم، رقم ۴۰۲۹) سے مرفوعاً مروی ہے۔ نووی کا کہنا ہے: چونکہ حضرت ابو ہریرہ خود کسان تھے، اس لیے اس فرمان نبوی کا بالالتزام ذکر کرتے۔

ضبط حدیث

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث کے دو دفتر (اصل: دو برتن) حاصل کیے۔ ایک کو تو میں نے لوگوں میں بانٹ دیا اور اگر دوسرے کو بھی عام کر دیتا تو یہ حلق کاٹ دیا جاتا (بخاری، رقم ۱۲۰)۔ دوسری روایت: تم مجھے سنگ سار کر دیتے (مستدرک حاکم، رقم ۶۱۶۲)۔ ابن کثیر کہتے ہیں: جس دفتر کو حضرت ابو ہریرہ نے نشر نہیں کیا، فتنوں اور صحابہ کے مابین ہونے والی جنگوں کے بارے میں ہو گا، جیسا کہ دیگر اصحاب کے اقوال سے اشارہ ملتا ہے۔ شیعہ محققین نے حضرت ابو ہریرہ کے اس قول پر کڑی تنقید کی ہے۔ ان کی خدمت میں حضرت علی کا یہ ارشاد پیش کیا جاتا ہے: لوگوں کو وہ بتاؤ جو وہ پہچانتے ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ و رسول کی تکذیب کی جائے؟ (بخاری، رقم ۱۲۷)۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے

کہا: میں جو احادیث آج بیان کرتا ہوں، عمر کے سامنے بیان کرتا تو وہ میرا سر پھاڑ دیتے۔ ذہبی کہتے ہیں: حلال و حرام سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو چھپانا کسی طرح جائز نہیں، اسی طرح سنت کا احیا کرنے کے لیے بھی فرامین رسول کو عام کرنا ضروری ہے۔ حضرت ابوہریرہ احادیث کا دوسرا حصہ (بر تن) نشر کرتے تو ہو سکتا ہے، انھیں ایذا دی جاتی یا قتل کر دیا جاتا۔

مروان نے مدینہ کی گورنری کے زمانے میں حضرت ابوہریرہ کی تمام مرویات کو احاطۂ تحریر میں لانے کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوہریرہ نہ مانے تو اس نے ایک کاتب کی مدد سے ان کی بیان کردہ احادیث لکھوا لیں۔ مجموعہ ان کو دکھایا گیا تو انھوں نے تلف کرا دیا (مستدرک حاکم، رقم ۶۱۶۳)۔

''صحیفہ'' میں ہمام بن منبہ نے اپنے استاد حضرت ابوہریرہ کی روایات جمع کی تھیں۔

مطالعۂ مزید: الجامع المسند للبخاری (شرکۃ دار الارقم)، المسند الصحیح للمسلم (دار السلام)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی أسماء الرجال (مزی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: J Robson)، Wikipedia (English, Arabic, Persian, Urdu)، Al-Islam org (A shi'te Encyclopedia)، Abu Hurayra and the Falsification of Traditions (محمود ابوریۃ)، شیخ المضیرۃ ابوہریرۃ (یاسین الجبوری)۔

[باقی]

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

محمد ذکوان ندوی

احتساب کا وقت

تیاری کے دور میں غفلت اور ظہور نتائج کے دور میں ماتم کسی زندہ قوم کا شعار نہیں۔ زندہ قوموں کے لیے یہ احتساب کا وقت ہوتا ہے، نہ کہ شکایت کا وقت۔ پیش آمدہ حالات پر منفی رد عمل صرف ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے، وہ پہلا موقع کھونے کے بعد دوسرے موقعے کو بھی کھودینا ہے۔

ہمارے لیے اب کرنے کا پہلا کام صرف یہ ہے کہ ہم آج ہی سے اُس غیر مومنانہ روش کو مکمل طور پر چھوڑ دیں جو ہماری ناکامی کا اصل سبب ہے، اور وہ ہے خدا اور رسول سے بغاوت اور اپنے ازلی دشمن شیطان اور اُس کے ساتھیوں سے محبت۔

اِس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایمان اور اخلاق کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا شعار بنائیں۔ گروہی 'مذہبیت' اور تعصبات سے بلند ہو کر اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اپنے اندر تعلیم اور شعوری بیداری کو فروغ دیں۔ انسانوں کے درمیان نفرت اور تشدد کے بجاے محبت اور خیر خواہی کے کلچر کو عام کریں۔ ملک کے لیے ایک وفادار شہری اور دینے والے ممبر (giver member) ثابت ہوں۔ اپنی دینی، دعوتی، اخلاقی اور انسانی ذمہ داریوں کی نسبت سے اپنے تمام معاملات کا جائزہ لے کر اُن کی از سر نو منصوبہ بندی کریں۔ نفس و شیطان اور دنیا پرستی سے اپنا رخ پھیر کر خدا پرستی اختیار کریں۔ ذکر و دعا اور مسجد سے اپنا ربط استوار کریں۔ صادقین کی صحبت اختیار کریں۔ اللہ کی کتاب قرآن مجید سے تلاوت و تدبر اور تذکر کے درجے کا زندہ تعلق قائم کریں۔ رسول خدا کی سیرت کو اپنی زندگی بنائیں اور خدا کے دوسرے بندوں تک اُس کے پیغام کو علم و حکمت اور

خیر خواہی کے ساتھ پہنچائیں۔

کیا عجب کہ موجودہ صورت حال ہمارے لیے ایک خدائی دھکا ہو تاکہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں، حالات سے گہرا سبق لیں اور دنیا کے عارضی اسٹیج پر ظاہر ہونے والی انسانی جماعتوں کے بجاے صرف اللہ سے خوف اور امید کا تعلق قائم کریں۔ ہم خدا کے فرماں بردار بن کر اُس کے اُن بندوں میں شامل ہو جائیں جن کے لیے نہ مایوسی ہے اور نہ ناکامی کبھی اُن کا مقدر بن سکتی ہے: 'وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ'[1] (المائدہ ۵: ۵۶)۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ اہل ایمان 'يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا'[2] (النساء ۴: ۱۳۶) کی خدائی پکار پر لبیک کہتے ہوئے 'يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً'[3] (البقرہ ۲: ۲۰۸) کا مجسم نمونہ بن جائیں۔ اِسی حقیقت پسندی اور اِسی جوہری تبدیلی و اصلاح میں ہماری کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ اِس کے سوا کامیابی کا دوسرا اور کوئی راستہ نہیں۔

(لکھنؤ، ۲۳ / مئی ۲۰۱۹ء)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۔ ''جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول اور سچے اہل ایمان کو اپنا دوست بنا لیں (وہی غالب ہوں گے)، اِس لیے کہ یقیناً یہ اللہ ہی کا گروہ ہے جو غالب رہنے والا ہے۔''

۲۔ ''ایمان کا دعویٰ کرنے والو، تم اللہ پر ایمان لاؤ، جیسا کہ اُس پر ایمان کا حق ہے۔''

۳۔ یہ اشارہ ہے اُس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ: ''ایمان والو، تم سب اللہ کی اطاعت میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

نوٹ: ۲۳ / مئی ۲۰۱۹ء کو انڈیا کے سترھویں جنرل الیکشن کے موقع پر 'وزڈم فاؤنڈیشن' (لکھنؤ) میں کچھ احباب کے سامنے راقم نے ایک مختصر گفتگو کی۔ یہ تحریر اِسی گفتگو کے خلاصے پر مبنی ہے۔

محمد تہامی بشر علوی

بے بسی، اُس وقت کی

دنیا میں اگر سارے انسانوں کو دو سادہ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ایک طبقہ ہے کم زوروں اور ماتحتوں کا اور دوسرا طبقہ طاقت وروں اور بااختیار لوگوں کا۔ اور طاقت وروں میں بھی کچھ ایسے طاقت ور ہیں کہ ان سے اوپر مزید کچھ اور طاقت ور ہیں۔ تو ہر ایک انسان کی دونوں حیثیتیں ہیں، کچھ پہلوؤں سے وہ خود طاقت ور ہے اور کچھ پہلوؤں سے وہ کم زور بھی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی خاوند ہے تو وہ اپنی بیوی کے لیے طاقت ور ہی ہو گا، لیکن وہی خاوند کسی جگہ ملازمت کر رہا ہے تو وہ وہاں اپنے آفیسر کے ماتحت کم زور حیثیت میں ہو گا۔

اب جس حیثیت سے وہ خود کم زور ہوتا ہے، وہاں اپنے سے بڑے طاقت ور کے حوالے سے اس کو ہمیشہ شکایت رہتی ہے۔ وہ کہتا رہتا ہے کہ وہ مجھے ستا رہا ہے، تنخواہ اپنے وقت پر نہیں دے رہا، وہ یہ مسائل پیدا کر رہا ہے، وہ مسائل پیدا کر رہا ہے۔ لیکن یہاں وہ ماتحت کی حیثیت سے اپنے سینئرز کے لیے جو شکایات کر رہا ہے، خود جو اس کے ماتحت ہیں، وہ بھی اس کے بارے میں یہی شکوے کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے آفیسر کی شکایت کرنے والا جہاں خود آفیسر کی حیثیت سے طاقت ور ہوتا ہے، مثلاً اپنے خاندان کے ادارے میں سربراہ ہے تو اس کی بیوی اس کے بارے میں شکایت کر رہی ہو گی کہ یہ گھر میں سیدھے منہ سے بات نہیں کرتا۔ جب بھی گھر آتا ہے، بدتمیزی کرتا ہے۔ بے وجہ گالیاں دیتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر میری بے عزتی کرتا ہے اور میرے والدین کو برا بھلا کہتا ہے وغیرہ۔

پھر یہی بیوی جب کسی کی ماں بنتی ہے تو وہ اپنے ماتحت اولاد کے اوپر زیادہ طاقت ور بن جاتی ہے۔ اگر اس کی

اولاد سے پوچھیں تو وہ بھی شکوے کرے گی کہ ہماری ماں ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہی، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ہمیں برا بھلا کہتی ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو طاقت دی ہے یا تھوڑا بہت اختیار دیا ہے، یہ اسے صحیح استعمال نہیں کرتا اور جب یہ اپنے سے زیادہ طاقت ور کی شکایت کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت یہ نہیں سوچتا کہ کہیں مجھے بھی کسی کم زور کے اوپر طاقت حاصل ہے، وہاں میں اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کر رہا ہوتا ہوں؟ ہوتا یہی ہے کہ لوگ اپنی اپنی جگہ اپنے اختیارات درست استعمال نہیں کرتے۔ وہ جس چیز کی شکایت دوسروں کے حوالے سے کر رہے ہوتے ہیں، اسی برائی میں یہ خود مبتلا ہوتے ہیں۔ تو یہ ساری چیزیں اصل میں اس وقت تک بیلنس میں نہیں آسکتیں جب تک کہ مذہب کا دیا ہوا تصور قیامت ہم صحیح طرح سے سمجھ نہیں لیتے۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو، خواہ وہ طاقت ور کی حیثیت سے کسی پر ظلم کر رہے ہو یا کسی مظلوم کی حیثیت سے ظلم سہ رہے ہو، تم سب نے لوٹ کر پھر میرے پاس آنا ہے، وہاں سب سے طاقت ور ذات انصاف کا ترازو لگا دے گی۔ وہاں ہر طاقت ور سے پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ وہاں چھوٹا سا کیا گیا ظلم بھی ہمارے سامنے آجائے گا اور ہمیں اس کا حساب دینا ہو گا۔ جس جس طاقت ور نے کم زور پر کوئی ستم کیا ہے، بہت بڑی طاقت ور ذات کے سامنے کل اس نے پیش ہونا ہے اور وہ طاقت ور ذات ہر کم زور کا بدلہ اسے دلا کر چھوڑے گی۔ یہی وہ تصور ہے جو انسان کو اپنے رویے میں بالکل محتاط کر دیتا ہے۔

کل جب خدا کے سامنے سارے کے سارے پیش ہوں گے، وہاں یہ آج کے طاقت ور بھی ہوں گے اور یہ آج کے کم زور اور مظلوم بھی ہوں گے، تب اللہ کہے گا: بتائیے، آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟[1] بتاؤ، آج کون طاقت ور ہے؟ عالم کے بادشاہ کی آواز سن کر ہر طرف سناٹا چھا جائے گا۔ کوئی بولنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ وہاں جتنے بھی انسان ہوں گے، سب پر سناٹا چھا جائے گا، کسی کو ہمت نہیں ہو گی کہ وہ کچھ کہہ سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ خود ہی کہے گا کہ آج کے دن تنہا اسی رعب اور دبدبے والے رب کی بادشاہی ہے۔ وہاں پھر ہر ایک کے اعمال کی ترازو بالکل انصاف کے ساتھ لگا دی جائے گی۔ جس جس کے ساتھ جو جو زیادتی ہوئی ہے، اس کا بدلہ وہاں چکا دیا

۱۔ المؤمن ۴۰: ۱۶۔ 'يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ'۔

جائے گا۔اور پھر ضابطہ یہ ٹھیرایا گیا ہے کہ کسی بندے نے کسی پر کوئی زیادتی کی ہوئی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اپنے اختیار سے کبھی معاف نہیں کرے گا، جب تک کہ وہ بندہ معاف نہ کرے۔

آج اگر خاوند صاحب بہت طاقت ور ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ کل قیامت کے دن اس کی بیوی طاقت ور ہوگی۔ اگر آج خاوند اپنے اختیار کے زور پر کہتا ہے کہ میری اجازت کے بغیر تو کچھ بھی نہیں کر سکتی، جو میں چاہوں گا تجھے وہی کرنا ہوگا، کیونکہ تو میری بیوی ہے اور میرے ماتحت ہے۔ وہ اختیارات کے گھمنڈ میں ہر جائز و ناجائز پابندیاں لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اسے یہ سب کرتے ہوئے اتنا یاد رہنا چاہیے کہ کل وہاں پر اس کی بیوی کے اختیارات بڑھ جائیں گے۔ بیوی سے کہا جائے گا کہ یہ تیرے سامنے تیرا خاوند بیٹھا ہوا ہے، بتا اس نے تیرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تھا یا برا؟ جب تک بیوی اس کی Ok رپورٹ نہیں دے دیتی، خاوند کو جنت میں نہیں بھیجا جا سکتا۔ اس وقت آپ کی حیثیت یہ ہوگی کہ آپ کی نجات بیوی کی رپورٹ پر منحصر ہو جائے گی۔ تب آپ بے بسی میں یہ حسرت کریں گے کہ کاش! آج بیوی مجھے معاف کر دے، پر تب یہ اس کی مرضی ہوگی، وہ چاہے تو معاف کر دے چاہے تو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لے لے۔ اسی طرح آج آپ کا آفیسر بڑا طاقت ور ہے تو کل یہ مزدور اور ملازم وہاں طاقت ور ہو جائیں گے۔ وہاں پھر یہ آفیسر صاحب اپنے غرور کو بھول کر بھکاریوں کی طرح کھڑے ہوں گے۔ اپنے ملازموں سے معافی کی بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ آج آفیسر صاحب کے Yes اور No میں بڑی طاقت ہے، مگر کل اس کے ملازم کے Yes اور No پر معاملہ اٹکا رہے گا۔ اگر اس کے ملازم نے Yes کر دیا تو ٹھیک ہے اور اگر No کر دیا تو یہ آفیسر صاحب پھنس جائیں گے۔

یہاں آج ہم جتنے بھی طاقت ور ہیں، کل وہاں ہم اتنے ہی کم زور اور بے بس ہوں گے۔ اور یہ جتنے جتنے لوگوں کو یہاں ہم نے ماتحت سمجھ کر اپنا غلام بنایا ہوا ہے، کل سب کے سامنے ہم ان سے معافی کی بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ مثال کے طور پر ہمارے ایم این اے صاحب ہیں۔ ان کو اس پورے حلقے کی نمایندگی ملی ہے اور اگر وہ اس پورے حلقے کے لوگوں کو ستا کر چلے جائیں گے تو پھر کل وہاں خدا کے سامنے ان سب ستائے ہوئے لوگوں کی Ok رپورٹ ملے گی تو ان کی بخشش ہو سکے گی۔ اگر ایم این اے صاحب یا کوئی اور وزیر صاحب اپنے اختیارات غلط استعمال کریں گے، میرٹ کی پامالی کریں گے، لوگوں کی حق تلفی کریں گے، تو کل وہاں ان کی جان چھوٹنی مشکل ہو جائے گی۔

آج ہم بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہمیں طاقت مل گئی ہے اور لوگوں کے اوپر ستم ڈھانا، انھیں ستانا، ان پر

اپنے اختیارات چلانا، ہمارے لیے آسان ہو گیا ہے۔ لیکن ہمیں اندازہ نہیں ہے کہ کل قیامت والے دن جب سارا معاملہ الٹے گا تو پھر ہمارا کیا بنے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ دو صحابہ کے حوالے سے تبصرہ فرمایا، ایک بڑے امیر صحابی تھے اور دوسرے بالکل غریب تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ جو امیر ہے، اس کے بارے میں جنت میں جانے کا فیصلہ بہت حساب دے دے کر بہت عرصے بعد ہو گا، اس لیے کہ جتنا زیادہ مال ہو گا، اتنے زیادہ حقوق لوگوں کے اس کے متعلق ہو جاتے ہیں۔

سارا احساب کتاب ہونے کے بعد ہی جنت کا فیصلہ ہو گا۔ اور یہ جو غریب ہے بے چارہ، چند روپوں کا مالک، مشکل سے گزر اوقات کرنے والا، یہ تو چٹکیوں میں اپنا حساب دے گا، فارغ ہو جائے گا اور فوراً جنت کو چلا جائے گا۔ باقی اس کے پاس اتنے پیسے تھے ہی کہاں جو زکوٰۃ، حج اور صدقات کے بارے میں اس سے پوچھا جاتا۔ دولت مندوں سے تو پوچھا جائے گا کہ انھوں نے محروموں، ضرورت مندوں، بے بسوں، مفلسوں اور حاجت مند رشتہ داروں کو بھی خدا کے دیے ہوئے مال میں سے کچھ دیا تھا یا نہیں؟ وہ اپنے ہی محلات تعمیر کرتے رہے یا پڑوس میں بنے کسی غریب کے جھونپڑے کی بھی کبھی فکر کی؟ وہ اپنے بچوں کی شادیاں تو فائیو سٹار ہوٹلوں میں ایک دھوم کے ساتھ کرتے رہے، مگر کیا کسی غریب کے بچے یا بچی کی شادی کی خوشیوں میں بھی کوئی رنگ بھرنے کی کوشش کی؟ تو یہاں جس کے پاس جتنا اختیار اور جتنی دولت ہے، اس سے اتنی ہی زیادہ پوچھ ہو گی۔ اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی مشورہ دیا ہے کہ مانگ کر اختیار و ذمہ داری کبھی نہ لو، البتہ جب تمھیں اپنی صلاحیت کی وجہ سے اختیار سونپ دیا جائے تو پھر اس اختیار کو امانت داری کے ساتھ ادا کرو تاکہ کل خدا کے سامنے پیش ہونے پر تمھیں ناکامی و شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

یہ بہت اہم اور سنگین مسئلہ ہے، اس کو محض افسانہ یا کوئی ہلکی سی بات نہیں سمجھنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ غریب کسے کہتے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ، ہمارے علم میں تو یہی ہے کہ جس کے پاس مال و دولت نہ ہو تو وہ غریب آدمی ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں نہیں، اصل غریب تو وہ ہو گا جس کی غربت کا عالم یہ ہو گا کہ دنیا میں بہت ساری نیکیاں کر کے چلا جائے گا، اور جب قیامت والے دن اللہ کے سامنے پہنچے گا تو بڑا خوش ہو گا کہ میں آج تو اپنے ساتھ نیکیوں کی بڑی دولت لے کر جا رہا ہوں، مگر وہاں اس سے حق طلب کرنے والے کئی لوگ کھڑے ہو جائیں گے۔ اس نے جس جس کی کوئی حق تلفی کی ہو گی، وہ سب خدا سے وہاں انصاف کا مطالبہ کریں گے۔ تو وہاں پھر اللہ تعالیٰ یہی

فیصلہ کریں گے کہ جس کا اس نے جو حق دینا ہے، اس کے بدلے میں اس کی نیکیاں اس کو دے دو۔ باری باری سب مطالبہ کرنے والوں کو اس کی نیکیاں دی جاتی رہیں گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوں کرتے کرتے اس کی سب نیکیاں ان مطالبہ کرنے والوں میں تقسیم ہو جائیں گی، لیکن مطالبہ کرنے والے ابھی باقی رہیں گے۔ تب کہا جائے گا کہ اس کے پاس دینے کو نیکیاں تو رہی نہیں ہیں، سو مطالبہ کرنے والوں کے گناہ اس کے ذمے ڈال دو۔ اس طرح ان کے گناہ اٹھا کر اس کے پلڑے میں ڈال دیے جائیں گے۔ یوں کرتے کرتے نتیجہ جب نکلے گا تو اس کی نیکیاں بھی ختم ہو جائیں گی اور دوسروں کی برائیاں اس کے پلڑے میں آجائیں گی اور آخری رپورٹ یہ آئے گی کہ اس کو اٹھا کر جہنم میں پھینک دیا جائے۔

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ہے وہ امیر آدمی جو بہت سی نیکیاں لے کر اس میدان میں پہنچا، مگر وہاں اس کی ساری نیکیاں کسی اور کے کام آ گئیں، اس کی یہ دولت اس کے کچھ کام نہیں آئی، اصل مفلس یہی مفلس ہے، اصل غریب یہی غریب ہے[۲]۔

کل کی اس بے بسی سے بچنے کے لیے ہمیں ابھی سے فکر کرنی ہو گی۔ آج ہمیں دنیا میں جتنا اختیار اور مقام حاصل ہے، اس لحاظ سے ہم انصاف کے ساتھ لوگوں کا حق ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں کر رہے تو پھر سمجھ لیں کہ ایک بہت بڑی آزمایش سے ہم دوچار ہو جائیں گے۔ آج بے فکری سے اختیار استعمال کر رہے ہوں گے تو کل ہم بالکل ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کی نظر آخرت پر رہتی تھی، وہ بہت تقویٰ اور فکر مندی سے جیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشورہ دیا گیا تھا کہ آپ اپنے بعد اپنے بیٹے کے لیے وصیت کر جائیں کہ آپ کے بعد امیر المومنین وہ ہو گا۔ اِس پر آپ نے فرمایا کہ میرے گلے میں ہی یہ پھندا کافی ہے، میں نہیں چاہتا کہ یہ پھندہ میری اولاد میں سے کسی کے گلے میں بھی ڈالا جائے۔

ان کی نظر چونکہ آخرت پر جمی رہتی تھی، وہ یقین کیے ہوئے تھے کہ یہ یہاں کے لحاظ سے تو ایک حکومت ہے، لیکن آخرت کے لحاظ سے بڑی مصیبت ہے۔ کل خدا کے سامنے اتنے لوگوں کا حساب دینا کوئی آسان کام ہے؟ خود حضرت عمر فاروق کی فکر مندی کا عالم تو یہ تھا کہ آپ نے فرمایا: اگر نیل کے ساحل کے کنارے ایک کتا بھی پیاس سے مر جائے تو مجھ سے اس کا حساب لیا جائے گا۔

۲۔ مسلم، رقم ۶۷۴۴۔

ہم میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ اختیارات تو رکھتا ہے۔ تو ہمیں اپنا اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ کیا ہم اپنے اختیارات درست استعمال کر رہے ہیں؟ آخرت کی اس پیشی کو سامنے رکھ کر اپنے اختیارات کو ٹھیک استعمال کرنا ضروری ہے۔ ہم نے اگر ایسا نہ کیا تو یہ بہت بڑی نادانی ہو گی اور اس غفلت کے نتیجے میں کل ہمیں بہت سخت سزا بھگتنی پڑ جائے گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد حسن الیاس

حدیث متواتر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال: حدیث متواتر کسے کہتے ہیں؟ عام خبر واحد اور حدیث متواتر کے حکم میں کیا کوئی فرق ہے؟ مسلمانوں کی علمی روایت میں موجود اصولیین اور محدثین، دونوں بعض احادیث کو متواتر قرار دیتے ہیں۔

کیا یہ وہی تواتر ہے جو قرآن مجید کے نقل کے موقع پر بیان کیا جاتا ہے، اور جس کی تعریف یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ 'خبر عدد یمتنع معه - لکثرته - تواطؤ علی کذب'، ''یعنی ایسی خبر جو اتنے لوگوں نے بیان کی ہو جن کی کثرت کی وجہ سے ان کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو''؟

جواب: حدیث پر تواتر کا حکم لگانے والے اہل علم اس بارے میں دو آرا رکھتے ہیں:

پہلی یہ کہ حدیث کے تواتر سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کسی خبر کا متواتر ہونا قطعیت، یعنی یقین کا فائدہ دیتا ہے، اسی طرح اگر کوئی اور خبر بھی قطعیت اور یقین کا فائدہ دے تو اس کی حیثیت بھی تواتر تک پہنچ جانی چاہیے۔ لہٰذا ان کے نزدیک حدیث کا تواتر کیفیت نقل کا نام نہیں، بلکہ ''علم القطع کے حصول کی بنیاد پر کسی خبر کا حکم ہے''۔

اس رائے کو اہل علم 'ما أفاد القطع' سے بیان کرتے ہیں، یعنی وہ خبر جس وقت وجود میں آئی تو ابتداً خبر واحد کے ہی طریقہ پر ہوئی اور نقل بھی وہ خبر واحد کے ہی اصول پر ہوئی ہے، لیکن اس خبر واحد میں جو بات بیان ہوئی،

وہ چونکہ قطعیت اور یقین کا فائدہ دیتی ہے، لہٰذا اس حدیث کو نتیجے کے لحاظ سے تواتر کے ''قائم مقام'' سمجھ لینا چاہیے۔

دوسری راے یہ ہے کہ اگر کسی خبر کو معتد بہ تعداد (جو کہ محدثین کے نزدیک مختلف ہے) میں لوگ بیان کرنا شروع کر دیں تو وہ بات بھی اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے جس درجہ میں کوئی متواتر خبر پہنچتی ہے۔ لہٰذا جب معاشرے میں افراد کی اتنی بڑی تعداد ان ''اخبار'' کو بیان کرنے لگ جائے جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عقلاً محال ہو تو اسے متواتر مان لینا چاہیے۔

ہمارے نزدیک ان دونوں آرا کے تحت حدیث پر تواتر کی صفت کو شامل کرنا محل نظر ہے۔

پہلی راے کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تواتر کا تعلق کسی عمل کے نقل ہونے کی ایک خاص کیفیت سے ہے۔ اس کا تعلق نفس مضمون کے صدق اور کذب سے نہیں ہے۔

مثلاً یہ بات کہ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد بیان کرتی ہے جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عقلاً محال ہے کہ محمد بن عبد اللہ ایک انسان تھے، جنھوں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا تھا تو یہاں رسول اللہ کے اس دعویٰ کی صداقت زیر بحث نہیں ہے۔ چونکہ لوگوں نے واقعے کو متواتر نقل کیا ہے، لہٰذا آپ سچے رسول ہی تھے، آپ کی رسالت کی سچائی اس متواتر انتقال خبر میں زیر بحث نہیں ہے، بلکہ اس دعویٰ کے مطلق حدوث پر انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کا اتفاق ہے جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عقلاً محال ہے۔ گویا یہ واقعات کے بارے میں انسانوں کا مشترک حافظہ ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ قائد اعظم پاکستان کے بانی تھے۔ یہ خبر متواتر ہے۔ پوری قوم بیان کرتی ہے، لیکن یہ بات بیان کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ہی کو بانی ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس دعوے کا تعلق دوسرے دلائل سے ہے، محض تواتر سے نہیں ہے۔

چنانچہ کسی قطعی حقیقت کو تواتر کے بغیر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، اس لیے خبر واحد کو 'ما أفاد القطع' کی وجہ سے تواتر کا قائم مقام بنانا درست نہیں ہے۔ تواتر نقل علم کی اصطلاح ہے، کسی بات کی قطعی صداقت کے حصول کا ماخذ نہیں ہے۔

دوسری راے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ تواتر کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے، بلکہ یہ نقل علم کی اصطلاح ہے۔ یہ اصطلاح علم و عقل کے مسلمات کو سامنے رکھ کر وضع کی گئی ہے۔ انسان اس طریقۂ نقل علم سے حقائق کا ادراک کرتا ہے۔ لہٰذا جس واقعہ کی اپنے حدوث سے آج تک ایسی اور اتنی بڑی تعداد میں لوگوں

نے گواہی دی ہو جن کا مل کر جھوٹ پر جمع ہونا عقلاً محال ہے تو اسے خبر متواتر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ خبریں جن کو محض معاشرے میں مشہور ہونے کی وجہ سے متواتر مان لیا گیا ہے، یعنی حدوث کے وقت تو نہیں، لیکن اس کے بعد لوگوں کی بڑی تعداد نے ان اخبار کو بیان کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے متواتر ہیں، یہ موقف درست نہیں ہے، اس لیے کہ تواتر اپنی ابتدا اور اپنے حدوث کے وقت سے تواتر کہلاتا ہے، نہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی خبر کے معروف یا مشہور ہو جانے سے وہ بات تواتر کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

چنانچہ ہمارے نزدیک تواتر خالص ''نقل علم'' کی اصطلاح ہے، یہ کوئی مذہبی اصطلاح نہیں ہے، لہٰذا کوئی خبر واحد کسی قطعی حقیقت کو بیان کر کے متواتر بن جاتی ہے، نہ اس کے ثبوت کے لیے افراد کی تعداد کو طے کرنے کا حق مذہبی علما کو حاصل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تواتر کے اسی محکم ذریعۂ نقل علم کو خدا کا دین پہنچانے کے لیے اختیار کیا ہے۔ اللہ کے رسول نے خدا کے کلام کو اپنے حدوث کے وقت ہی سے انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو سنایا، لکھایا، دہرایا جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عقلاً محال تھا، اسی لیے آج بھی ہم پورے اعتماد سے دنیا کو یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کلام دو، چار، آٹھ افراد نے نہیں، بلکہ انسانی نسلوں نے منتقل کیا ہے، بالکل ایسے جیسے یہ نسلیں آج بھی حقائق منتقل کرتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب باتیں ہم تک خبر آحاد ہی کے طریقے پر منتقل ہوئی ہیں۔ یہ آپ کی زندگی کا تاریخی ریکارڈ ہے۔ کسی خبر واحد پر اگر ہمارا اطمینان ہے کہ یہ رسول اللہ سے منسوب صحیح بات ہے اور اس میں دین سے متعلق کوئی ایسی مستقل بالذات ہدایت بیان نہیں ہوئی جو دین کے اصل ماخذ —— قرآن وسنت —— میں موجود نہیں ہے تو ہر وہ خبر واحد بھی اسی بنا پر واجب اطاعت ہے۔ اس مقصد کے لیے اس خبر آحاد کے نقل کی کیفیت کو تبدیل کرنا اور اسے قرآن مجید کے برابر لا کھڑا کرنا خلاف حقیقت ہے، اس لیے کسی حدیث پر متواتر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Trusted Name for Last 65 years

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949

Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified
ISO 9001 : 2000

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk

Tel: 021-38682810